ماہنامہ السنۃ جہلم ، شمارہ نمبر ۳۰
جمادیٰ اُولیٰ ۱۴۳۲ھ ، الموافق اپریل ۲۰۱۱ء

1	معرکہ حق و باطل	غلام مصطفیٰ ظہیر امن پوری	02
2	اسلاف پرستی سے اصنام پرستی تک	غلام مصطفیٰ ظہیر امن پوری	07
3	کیا نبیٔ اکرم ﷺ نے اللہ تعالیٰ کو دیکھا ہے؟	غلام مصطفیٰ ظہیر امن پوری	14
4	نبیٔ اکرم ﷺ کا خون کسی صحابی نے نہیں پیا	غلام مصطفیٰ ظہیر امن پوری	22
5	کیا کسی صحابی سے نبیٔ اکرم ﷺ کا پیشاب پینا ثابت ہے؟	غلام مصطفیٰ ظہیر امن پوری	29
6	''ضعیف+ضعیف=حسن'' کی حجیت؟ امام ترمذی رحمہ اللہ اور ان کی اصطلاحِ ''حسن''	حافظ ابو یحییٰ نور پوری	32
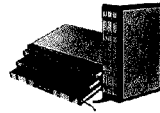
السنة کے مستقل قارئین جانتے ہیں کہ باطل عقائد کے خلاف قرآن وسنت کے دلائل سے مزین ومبرہن ردّ ''معرکہ حق و باطل'' کے نام سے سلسلہ وار جاری ہے ۔ اس کی تیسری قسط پیشِ خدمت ہے۔ ح،ا،ی

عقیدہ نمبر ⑥ : ١۔ سیدنا جابر بن عبداللہ انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: **إنّ النبيّ صلّى اللّٰه عليه وسلّم أمر الشمس ، فتأخّرت ساعة من نهار .** ''نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سورج کو حکم دیا تو وہ دن کا کچھ حصہ لیٹ ہوگیا۔''(المعجم الکبیر للطبرانی : ٤٠٥١)

تبصرہ : یہ باطل (جھوٹی) روایت ہے، کیونکہ:

① اس کے راوی احمد بن عبد الرحمٰن بن المفضل کے بارے میں حافظ ہیثمی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: **لم أعرفه .** ''میں اسے پہچان نہیں پایا۔''
(مجمع الزوائد للهيثمی : ٤٦/٩)

② اس کے راوی ولید بن عبدالواحد التیمی کو سوائے امام ابنِ حبان (٢٢٤/٩) کے کسی نے ثقہ نہیں کہا، لہٰذا یہ ''مجہول الحال'' راوی ہے۔

③ ابوالزبیر ''مدلس'' راوی ہیں اور سماع کی صراحت نہیں کررہے۔

فائدہ : اگر کوئی کہے کہ احمد بن عبدالرحمٰن الحرانی کی محفوظ بن بحر راوی نے متابعت کی ہے۔(طرق حديث ردّ الشمس لابی الحسن شاذان الفضلی بحواله اللآلی

المصنوعة للسیوطی : ۳٤۱/۱) تو اس کا جواب یہ ہے کہ محفوظ بن بحر کے بارے میں ابوعروبہ (م ۳۱۸ھ) فرماتے ہیں : **کان یکذب .** ''یہ جھوٹ بولا کرتا تھا۔''

(الکامل فی ضعفاء الرجال لابن عدی : ٦/٤٤١)

نیز امام ابنِ عدی رحمہ اللہ خود فرماتے ہیں : **لـه أحـاديـث يوصلها وغيره يرسلها ، وأحاديث يرفعها وغيره يوقفها على الثقات .**

''اس نے بہت سی ایسی احادیث کو موصول بیان کر دیا ہے جن کو اس کے علاوہ دوسرے ثقہ راوی مرسل بیان کرتے ہیں ، نیز اس نے بہت سی ایسی احادیث کو مرفوع بیان کر دیا ہے جن کو دوسرے راوی ثقہ راویوں سے موقوف بیان کرتے ہیں ۔''

(الکامل فی ضعفاء الرجال لابن عدی : ٦/٤٤١)

سوائے امام ابنِ حبان رحمہ اللہ (۹/۲۰۴) کے کسی نے اسے ثقہ نہیں کہا ، لہٰذا یہ راوی ''ضعیف'' ہے ۔ اس کے باوجود حافظ ہیثمی (مجمع الزوائد : ۸/۲۹۷) اور حافظ ابنِ حجر (فتح الباری : ٦/۲۲۱) کا اس کی سند کو ''حسن'' قرار دینا تساہل پر مبنی ہے ۔

اس ''ضعیف'' اور جھوٹی روایت کو بنیاد بنا کر ''اعلیٰ حضرت'' احمد رضا خان بریلوی صاحب نے یوں سرخی جمائی ہے : **''نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا حکم شمس وقمر ، تمام ملکوت السموات والارض پر حاوی ہے ، آفتاب کو حکم دیا کہ ٹھہر جا ، فوراً ٹھہر گیا ، اسی طرح چاند''**

(الامن والعلی از احمد رضا خان بریلوی : ص۱۲۲)

۲ ۔ سیدنا عباس بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں : ''میں نے نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا گھوارے میں چاند سے باتیں فرماتے انگشتِ مبارک سے اشارہ کرتے ، چاند اُس طرف جھک جاتا ۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : **إنّـي كـنـت أحـدّثـه ويـحـدّثـنـي ويلهني عن البكاء وسمع وجبته حين يسجد تحت العرش .** ہاں میں اس سے باتیں کرتا تھا ، وہ بھی مجھ سے باتیں کرتا اور مجھے رونے سے بہلاتا ۔ میں اس

کے گرنے کا دھما کہ بھی سنتا تھا جب وہ زیرِ عرش سجدے میں گرتا ۔''

(دلائل النبوة للبيهقى : ٤١/٢، تاريخ ابن عساكر : ٣٦٠/٤)

تبصرہ : یہ جھوٹ کا پلندہ ہے ۔اس کے راوی احمد بن ابراہیم الحلبی کے بارے میں خود امام بیہقی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ ''مجہول'' ہے ، جبکہ یہ کذاب اور اپنی طرف سے جھوٹی حدیثیں گھڑ کر رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کرنے والا راوی تھا ۔ اس کے بارے میں امام ابوحاتم الرازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں : **لا أعرفه ، وأحاديثه باطلة موضوعة كلّها ، ليس لها أصول ، يدل حديثه على أنّه كذّاب .**

''میں اسے جانتا تو نہیں ، البتہ اس کی بیان کردہ تمام احادیث باطل اور جھوٹی ہیں ۔ ان کی کوئی اصل نہیں ۔اس کی بیان کردہ حدیثیں بتاتی ہیں کہ یہ جھوٹا راوی تھا ۔''

(الجرح والتعديل لابن ابى حاتم : ٤٠/٢)

حافظ ابن الجوزی رحمہ اللہ نے اسے ''کتاب الضعفاء والمتروکین'' میں ذکر کیا ہے ۔صرف امام ابنِ حبان رحمہ اللہ (۱۰۱/۹) نے ''مجہول'' راویوں کو ثقہ قرار دینے والے قاعدے کے تحت اسے ثقہ قرار دیا ہے ۔

جناب احمد رضا خان بریلوی صاحب ان باطل روایات پر اپنے عقیدے کی بنیاد رکھتے ہوئے لکھتے ہیں : '' جب دودھ پیتوں کی حکومتِ قاہرہ ہے تو اب کہ خلافۃ اللہ الکبریٰ کا ظہور عین شباب پر ہے ۔آفتاب کی کیا جان کہ ان کے حکم سے سرتابی کرے ۔آفتاب و ماہتاب درکنار واللہ العظیم ملائکہ مدبرات الامر کہ تمام نظم ونسق عالم جن کے ہاتھوں پر ہے ، محمد رسول اللہ خلیفۃ اللہ الاعظم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے دائرۂ حکم سے باہر نہیں نکل سکتے ۔''

(الامن والعلیٰ از احمد رضا خان بریلوی : ص۱۲۳)

ظاہر ہے کہ جن عقائد کی بنیاد ایسی روایات پر ہو وہ عقائد لازمی طور پر مبالغہ آمیز اور باطل ہی ہوں گے ۔

''اعلیٰ حضرت'' احمد رضا خان بریلوی صاحب لکھتے ہیں : ''سیدنا سلیمان علیہ الصلاۃ والسلام کی نمازِ عصر گھوڑوں کے ملاحظہ میں قضا ہوئی حتّی تو ارت بالحجاب یہاں تک کہ سورج پردے میں جا چھپا۔ ارشاد فرمایا: رُدّوھا علیّ . پلٹا لاؤ میری طرف ۔ سیدنا علی سے اس آیت کریمہ کی تفسیر میں مروی ہے کہ سلیمان علیہ السلام کے اس قول میں ضمیر آفتاب کی طرف ہے اور خطاب اُن ملائکہ (فرشتوں) کو جو آفتاب پر متعین ہیں ، یعنی سلیمان نے اُن فرشتوں کو حکم دیا کہ ڈوبے ہوئے آفتاب کو واپس لے آؤ ۔ وہ حسب الحکم واپس لائے یہاں تک کہ مغرب ہو کر پھر عصر کا وقت ہو گیا اور سلیمان علیہ السلام نے نماز ادا فرمائی ۔'' (الامن والعلیٰ از احمد رضا خان بریلوی : ص ۱۲۴)

تبصرہ : یہ جھوٹی کہانی ہے جسے ''اعلیٰ حضرت'' عقیدہ کے باب میں مزے لے لے کر بیان کر رہے ہیں ۔

حافظ ابنِ حجر رحمہ اللہ (۷۷۳۔۸۵۲ھ) اس روایت کے بارے میں فرماتے ہیں :

وھذا لا یثبت عن ابن عبّاس ولا عن غیرہ ، والثابت عن جمھور أھل العلم بالتفسیر من الصحابۃ ومن بعدھم أنّ الضمیر المؤنث فی قولہ ﴿رُدُّوھَا﴾ للخیل ، واللّٰہ أعلم .

''یہ بات نہ سیدنا ابنِ عباس رضی اللہ عنہما سے ثابت ہے نہ کسی اور صحابی سے ۔ جمہور مفسرین صحابہ وتابعین سے جو بات ثابت ہے وہ یہ ہے کہ فرمانِ باری تعالیٰ ﴿رُدُّوھَا﴾ میں ضمیر گھوڑوں کی طرف لوٹتی ہے ۔ واللہ اعلم !'' (فتح الباری : ۲۲۲/۶)

بے سروپا اور بے سند روایات سے عقیدہ ثابت کرنا اہلِ حق کا وطیرہ نہیں ۔

فائدہ : سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

((غزا نبیّ من الأنبیاء .... فقال للشمس : أنت مأمورۃ وأنا مأمور ،

اللّٰهمّ احبسها عليّ شيئا ، فحبست عليه حتّى فتح اللّٰه عليه))

''اللہ تعالیٰ کے ایک نبی نے (دشمنوں کے ساتھ لڑائی کی)............انہوں نے سورج سے کہا: تو بھی (اللہ کے حکم کا) پابند ہے اور میں بھی پابند ہوں ۔ اے اللہ! تو اس سورج کو میرے لیے کچھ دیر روک دے ۔ سورج کو اس نبی کی فتح تک روک دیا گیا۔''

(صحیح البخاری : ۱/۴۴۰، ح : ۳۱۲۳، صحیح مسلم : ۲/۸۵، ح : ۱۷۴۷)

ایک نبی کا طرزِ عمل بھی دیکھیں کہ وہ کس طرح خشوع وخضوع سے اللہ تعالیٰ کے دربار میں التجا کر رہے ہیں ۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان کی دُعا کو شرفِ قبولیت سے نوازا ۔ سورج اللہ کے حکم سے کچھ دیر کے لیے رُک گیا ۔ ملاحظہ فرمائیں کہ اللہ کے اس نبی نے اللہ تعالیٰ سے دُعا اسی لیے کی تھی کہ ان کا حکم سورج پر نہیں چلتا تھا ، بلکہ وہ تو اسے مخاطب ہو کر فرما رہے ہیں کہ تم بھی حکمِ الٰہی کے ماتحت ہوں اور میں بھی ۔

کیا کبھی نبیِ اکرم ﷺ نے صحابہ کرام کو کوئی حکم دینے کے بجائے اللہ تعالیٰ سے دُعا کی تھی کہ اے اللہ ! تُو ان کو میرے لیے اس کام پر مامور کر دے؟ یقیناً ایسا کبھی نہیں ہوا ، کیونکہ صحابہ کرام پر رسول اللہ ﷺ کا حکم چلتا تھا ۔ اسی طرح اگر سورج چاند اور دوسرا نظام عالم کسی نبی کے ماتحت ہوتا تو وہ اللہ تعالیٰ سے دُعا کرنے کے بجائے ڈائریکٹ سورج کو رُکنے کا حکم دے دیتے !

''اعلیٰ حضرت'' کا یہ کہنا کہ: ''نبی کریم ﷺ کا حکم شمس وقمر ، تمام ملکوت السماوات والارض پر جاری ہے۔''

کس قدر بے دلیل اور مبالغہ آمیزی والا عقیدہ ہے جو واضح طور پر قرآن وحدیث اور اجماعِ امت کے بھی منافی ہے ۔ ہدایت کی توفیق تو اللہ ہی کے پاس ہے ۔

غلام مصطفیٰ ظہیر امن پوری

اسلاف پرستی سے اصنام پرستی تک

اسلاف پرستی ہی دراصل اصنام پرستی ہے۔ دنیا میں شرک اولیاء وصلحاء کی محبت وتعظیم میں غلو کے باعث پھیلا۔ اس حقیقت کو مشہور مفسر علامہ فخر الدین رازی (۵۴۴۔۶۰۶ھ) نے یوں آشکارا کیا ہے۔

إنّهم وضعوا هذه الأصنام والأوثان على صور أنبيائهم وأكابرهم، وزعموا أنّهم متى اشتغلوا بعبادة هذه التماثيل فإنّ أولئك الأكابر تكون شفعاء لهم عند الله تعالىٰ، ونظيره في هذا الزمان اشتغال كثير من الخلق يتعظّم قبور الأكابر على اعتقاد أنّهم إذا عظّموا قبورهم فإنّهم يكونون شفعاء لهم عند الله.

''مشرکین نے اپنے انبیائے کرام اور اکابر کی شکل وصورت پر بت اور مُورتیاں بنا لی تھیں۔ ان کا اعتقاد تھا کہ جب وہ ان مُورتیوں کی عبادت کرتے ہیں تو یہ اکابر اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کی سفارش کرتے ہیں۔ اس دور میں اس شرک کی صورت یہ ہے کہ بہت سے لوگ اپنے اکابر کی قبروں کی تعظیم میں مصروف ہیں۔ ان کا اعتقاد ہے کہ اکابر کی قبروں کی تعظیم کرنے کی وجہ سے وہ اکابر اللہ کے ہاں ان کے سفارشی بنیں گے۔'' (تفسیر الرازی: ۲۲۷/۱۷)

قرآن و حدیث میں قبر پرستی کے جواز پر کوئی دلیل نہیں۔ اس کے برعکس قبر پرستی کی واضح مذمت موجود ہے۔ یہ قبوری فتنہ شرک کی تمام صورتوں اور حالتوں پر حاوی ہے۔ غیراللہ سے استمداد، استعانت اور استغاثہ، مخلوق کے نام پر نذر و نیاز اور اس سے امیدیں وابستہ کرنا قبر پرستی کا ہی شاخسانہ ہے۔

قرآنِ کریم نے اہل فکر ونظر کو ان الفاظ میں دعوتِ توحید دی ہے:

﴿قُلِ ادْعُوا الَّذِينَ زَعَمْتُمْ مِنْ دُونِ اللّٰهِ لَا يَمْلِكُونَ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ فِي

السَّمَاوَاتِ وَلَا فِي الْأَرْضِ وَمَا لَهُمْ فِيهِمَا مِنْ شِرْكٍ وَّمَا لَهُ مِنْهُمْ مِنْ ظَهِيرٍ ☆ وَلَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ عِنْدَهُ إِلَّا لِمَنْ أَذِنَ لَهُ﴾ (سبا : ۲۲،۲۳)

''(اے نبی) کہہ دیجیے! تم ان لوگوں کو پکارو جن کو تم اللہ کے سوا (معبود) سمجھتے ہو۔ وہ تو آسمان و زمین میں ایک ذرے کے بھی مالک نہیں، نہ ان کا آسمان و زمین میں کوئی حصہ ہے نہ ان میں سے کوئی اللہ تعالیٰ کا معاون ہے نہ اللہ کے ہاں کوئی سفارش فائدہ دیتی ہے، ہاں جس شخص کے لیے وہ خود اجازت دے۔''

شیخ الاسلام ثانی، عالم ربانی، امام ابنِ قیم رحمہ اللہ (۶۹۱۔۷۵۱ھ) اس آیت کے متعلق لکھتے ہیں: فتأمّل كيف أخذت هذه الآية على المشركين بمجامع الطرق الّتي دخلوا منها إلى الشرك وسدّتها عليهم أحكم سدّ وأبلغه، فإنّ العابد إنّما يتعلّق بالمعبود لما يرجو من نفعه، وإلّا فلو لم يرج منه منفعة لم يتعلّق قلبه به، وحينئذ فلا بدّ أن يكون المعبود مالكا للأسباب الّتي ينفع بها عابده، أو شريكا لمالكها أو ظهيرا أو وزيرا ومعاونا له أو وجيها ذا حرمة وقدر يشفع عنده، فإذا انتفت هذه الأمور الأربعة من كلّ وجه وبطلت انتفت أسباب الشرك وانقطعت موادّه، فنفى سبحانه عن آلهتهم أن تملك مثقال ذرّة في السموات والأرض، فقد يقول المشرك: هي شريكة لمالك الحقّ فنفى شركتها له، فيقول المشرك: قد تكون ظهيرا ووزيرا ومعاونا، فقال: وماله منهم من ظهير، فلم يبق إلّا الشفاعة فنفاها عن آلهتهم وأخبر أنّه لا يشفع عنده أحد إلّا بإذنه. ''آپ غور کریں کہ اس آیت نے مشرکین کا کس طرح ناطقہ بند کیا ہے۔ ان کے شرک میں داخل ہونے کے دروازوں کو کس قدر پختگی اور عمدگی سے بند کیا ہے۔ کوئی عبادت کرنے والا اپنے معبود سے اسی لیے تعلق رکھتا ہے کہ اسے اس سے کسی فائدے کی امید ہوتی ہے۔ اگر معبود سے کسی فائدے کی توقع نہ ہو تو عبادت کرنے

والے کا دل معبود سے نہیں لگتا ۔ تب ضروری ہے کہ معبود یا تو ان اسباب کا مالک ہو جن سے عبادت گزار کو فائدہ ہو یا معبود ان اسباب کے مالک کا ساجھی اور حصہ دار ہو یا اس کا معاون یا وزیر ومشیر ہو یا مالکِ اسباب کی نظر میں اس قدر جاہ وجلال کا حامل ہو کہ وہ اس کی سفارش کو ردّ نہ کر سکے ۔ جب یہ چاروں اُمور ہر طرح سے باطل ہیں تو شرک کے اسباب کی بھی نفی ہو گئی اور اس کی بنیادیں اُکھڑ گئیں ۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے مشرکین کے معبودوں کے بارے میں آسمان و زمین کے ایک ذرے کے مالک ہونے کی بھی نفی کر دی ہے ۔ بسا اوقات مشرک کہہ دیتا ہے کہ یہ معبودان مالکِ حقیقی کے ساجھی ہیں ۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے حصہ دار ہونے کی نفی کر دی ۔ پھر مشرک کہہ دیتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے معاون ، وزیر یا دستِ راست ہیں ۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ان میں سے اس کا کوئی بھی معاون نہیں ۔ اب صرف شفارش کی بات رہ گئی تھی تو اللہ تعالیٰ نے ان کے معبودوں سے اس کی بھی نفی کر دی اور فرمایا کہ اس کے دربار میں اس کی اجازت کے بغیر کوئی سفارش نہیں کر سکتا ۔''

(الصواعق المرسلة لابن القيم : ٤٦٢،٤٦١/٢)

جو لوگ اہل قبور کو نفع ونقصان ، عزت و دولت ، حیات وموت ، صحت ومرض اور فراخی وتنگی کا مالک سمجھتے ہیں ان کے ردّ میں شیخ الاسلام ابنِ تیمیہ (٦٦١ ـ ٧٢٨ھ) فرماتے ہیں :

عامّة المذكور من المنافع كذب ، فإنّ هؤلاء الّذين يتحرّون الدعاء عند القبور وأمثالهم إنّما يستجاب لهم فى النادر ، ويدعو الرجل منهم ما شاء اللّٰه من دعوات ، فيستجاب له فى واحدة ، ويدعو خلق كثير منهم ، فيستجاب للواحد بعد الواحد ، وأين هذا من الّذين يتحرّون الدعاء فى أوقات الأسحار ويدعون اللّٰه فى سجودهم وأدبار صلواتهم وفى بيوت اللّٰه ، فإنّ هؤلاء إذا ابتهلوا ابتهالا من جنس القبوريّين لم تكد تسقط لهم دعوة إلّا لمانع ، بل الواقع أنّ الابتهال الّذى يفعله القبوريّون إذا فعله المخلصون لم يردّ

المخلصون إلّا نادرا ، ولم يستجب للقبوريّين إلّا نادرا ، والمخلصون كما قال النبى صلّى اللّٰه عليه وسلّم : ((ما من عبد يدعو اللّٰه بدعوة ليس فيها إثم ولا قطيعة رحم إلّا أعطاه اللّٰه بها إحدى خصال ثلاث : إمّا أن يعجل اللّٰه له دعوته ، أو يدّخر له من الخير مثلها ، أو يصرف عنه من الشرّ مثلها)) ، قالوا : يا رسول اللّٰه ! إذًا نكثر ، قال : ((اللّٰه أكثر)) (مصنف عبد الرزاق : ٦/٢٢، الرقم : ٢٩١٧٠، مسند أبى يعلى : ٢/٢٩٧، ح : ١٠١٩، مسند الامام احمد: ٣/١٨، الأدب المفرد للبخارى : ح ٧١٠، وصحّح الحاكم (١٨١٦) إسناده ، وسندهٗ حسنٌ)، **فهم فى دعائهم لا يزالون بخير ، وأمّا القبوريّون فإنّهم إذا استجيب لهم نادرا فإنّ أحدهم يضعف توحيده ويقلّ نصيبه من ربّه ، ولا يجد فى قلبه من ذوق طعم الإيمان وحلاوته ما كان يجده السابقون الأوّلون .** ''(قبر پرستی کے) جو اکثر فائدے ذکر کیے جاتے ہیں وہ جھوٹ پر مبنی ہوتے ہیں ۔ یہ مشرک لوگ قبروں وغیرہ کے پاس جا کر کثرت سے دُعا کرتے ہیں ۔ بس کبھی کبھار وہ دعا (اللہ کی طرف سے) قبول ہو جاتی ہے ۔ اور کوئی مشرک بہت سی دُعائیں کرتا ہے لیکن اُن میں سے کوئی ایک دُعا قبول ہوتی ہے ۔ پھر بہت سے مشرک لوگ دُعا کرتے ہیں تو ان میں سے کبھی کسی ایک کی اور کبھی کسی ایک کی دُعا قبول ہوتی ہے ۔ یہ کیفیت ان لوگوں کو کہاں لاحق ہوتی ہے جو سحری کے وقت اللہ تعالیٰ سے دُعا کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کو اپنے سجدوں میں ، اپنی نمازوں کے آخر میں اور مساجد میں پکارتے ہیں ۔ یہ موحد لوگ جب ان قبر پرستوں کی طرح گڑگڑا کر دُعا کریں تو ممکن نہیں کہ ان کی کوئی دُعا ردّ ہو جائے ۔ حقیقت یہ ہے کہ جب موحد لوگ اس طرح اللہ تعالیٰ سے دُعا کریں تو ان کی دُعا بہت کم ردّ ہوتی ہے ، جبکہ قبر پرستوں کی دُعا قبول ہی بہت کم ہوتی ہے ۔ موحدین کی دُعا کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے : **((ما من عبد يدعو اللّٰه بدعوة ليس فيها إثم ولا قطيعة رحم إلّا أعطاه اللّٰه بها إحدى خصال ثلاث : إمّا**

أن يعجّل اللّٰه له دعوته ، أو يدّخر له من الخير مثلها ، أو يصرف عنه من الشرّ مثلها)) ، قالوا : يا رسول اللّٰه ! إذًا نكثر ، قال : ((اللّٰه أكثر)) (کوئی بھی مسلمان بندہ جب اللہ تعالیٰ سے کوئی ایسی دعا کرتا ہے جس میں کوئی گناہ یا رشتہ داروں سے قطع تعلقی کی بات نہ ہو تو اللہ تعالیٰ اسے تین باتوں میں سے ایک عطا فرما دیتا ہے ۔ یا تو اس کی دُعا فوراً قبول کر لیتا ہے یا اس دُعا کی مثل کوئی اور بھلائی اسے عطا فرما دیتا ہے یا اس سے کوئی ایسا ہی نقصان دُور کر دیتا ہے ۔صحابہ کرام نے عرض کیا : اے اللہ کے رسول ! اگر یہ بات ہے تو پھر ہم بہت زیادہ دُعائیں کریں گے ۔ آپ ﷺ نے فرمایا : اللہ تعالیٰ اس سے بھی زیادہ عطا فرمانے والا ہے)(مصنف عبد الرزاق : ۲۲/۶، الرقم : ۲۹۱۷۰، مسند أبی یعلی : ۲۹۷/۲، ح : ۱۰۱۹، مسند الامام احمد: ۱۸/۳، الأدب المفرد للبخاری : ح ۷۱۰، وصحّح الحاکم (۱۸۱٦) إسنـــاده ، وسندهٗ حسنٌ) ۔موحد لوگ اپنی دُعاؤں میں ہمیشہ بہتری میں رہتے ہیں ۔ اس کے برعکس قبر پرست لوگوں کی جب کبھی کبھار کوئی دُعا قبول ہو جاتی ہے تو ان کی توحید کمزور ہو جاتی ہے ، اپنے ربّ سے ناطہ وتعلق کم ہو جا تا ہے اور وہ اپنے دل میں ایمان کی وہ حلاوت اور ذائقہ محسوس نہیں کرتے جو پہلے مسلمان محسوس کرتے تھے ۔''

(اقتضاء الصراط المستقیم لابن تیمیة : ۶۸۹/۲)

قبر پرستی ایک بے دلیل عمل

بعض الناس جو معاملہ اپنے بزرگوں کی قبروں کے ساتھ کرتے ہیں ، سلف صالحین اس سے بالکل بے خبر تھے ۔ یہ کیسا دین ہے جس سے سلفِ امت غافل رہے ہوں ؟

حافظ ابنِ قیم رحمہ اللہ نے کیا خوب فرمایا ہے : **هل یمكن لبشر علی وجه الأرض أن یأتی عن أحد منهم (أی السلف الصالح) بنقل صحیح أو حسن أو ضعیف أو منقطع أنّهم كانوا إذا كان لهم حاجة قصدوا القبور فدعوا عندها ، وتمسّحوا بها فضلا أن یصلّوا عندها أو یسألوا اللّٰه بأصحابها أو یسألوهم**

حوائجهم ، فليوقفونا على أثر واحد أو حرف واحد فى ذلک .

''کیا روئے زمین پر کسی انسان کے لیے یہ ممکن ہے کہ وہ سلف صالحین میں سے کسی ایک سے کوئی ایک صحیح یا حسن یا ضعیف یا منقطع روایت بیان کرے کہ جب ان کو کوئی ضرورت ہوتی تھی تو وہ قبروں کی طرف جاتے اور ان کے پاس دُعا کرتے اور ان سے لپٹتے ہوں ۔ ان سے قبروں کے پاس نماز پڑھنے ، اہل قبور کے طفیل اللہ سے دُعا مانگنے یا اہل قبور سے اپنی حاجت روائی کی التجا کرنے کا ثبوت تو دُور کی بات ہے ۔ مشرکین ہمیں کوئی ایک ایسی روایت یا اس بارے میں کوئی ایک لفظ دکھا دیں ۔''

(إغاثة اللهفان فی مصاید الشیطان لابن القیم : ۳۱۸/۱)

نیز شیخ الاسلام ابنِ تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں : فقد کان من قبور أصحاب رسول اللّٰه صلّی اللّٰه علیه وسلّم بالأمصار عدد کثیر ، وعندهم التابعون ومن بعدهم من الأئمّة ، وما استغاثوا عند قبر صحابیّ قطّ ولا استسقوا عنده ولا به ، ولا استنصروا عنده ولا به ، ومن المعلوم أنّ مثل هذا ممّا تتوفّر الهمم والدواعی علی نقله ، بل علی نقل ما هو دونه ، ومن تأمّل کتب الآثار وعرف حال السلف تیقّن قطعا أنّ القوم ما کانوا یستغیثون عند القبور ولا یتحرّون الدعاء عندها أصلا ، بل کانوا ینهون عن ذلک من یفعله من جهّالهم .

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کی قبروں کی ایک بہت بڑی تعداد شہروں میں تھی ۔ ان قبروں کے پاس تابعین اور ان کے بعد والے ائمہ دین رہتے تھے لیکن انہوں نے کبھی کسی صحابی کی قبر کے پاس آ کر مدد طلب نہیں کی اور نہ قبروں کے پاس اللہ سے بارش طلب کی نہ ان کے طفیل ایسا کیا ، نہ ان قبروں کے پاس مدد طلب کی نہ ان کے طفیل ایسا کیا ۔ یہ بات تو معلوم ہے کہ ایسے واقعات اگر رونما ہوں تو ان کو نقل کرنے کے اسباب و وسائل بہت زیادہ ہوتے ہیں بلکہ اس سے کم درجے کے واقعات بھی نقل ہوتے

رہتے ہیں ۔ جو شخص آثارِ سلف کی کتب کا غور سے مطالعہ کر کے سلف صالحین کے حالات کو پہچان لے گا اسے قطعی طور پر یقین ہو جائے گا کہ وہ لوگ قبروں کے پاس نہ مدد طلب کرتے تھے نہ کبھی (اپنے لیے) دُعا کرنے کے لیے وہاں جاتے تھے بلکہ اس دور کے جو جاہل لوگ ایسا کرتے تھے اسلاف انہیں اس سے منع کرتے تھے ۔'' (اقتضاء الصراط المستقیم : ٦٨١/٢)

حافظ ابنِ کثیر رحمہ اللہ (٧٠٠۔٧٧٤ھ) اکابر پرستی کو شرک کا موجب قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں: وأصل عبادة الأصنام من المغالاة فی القبور وأصحابها ، وقد أمر النبی صلّی اللّٰہ علیه وسلّم بتسویة القبور وطمسها ، والمغالاة فی البشر حرام . ''بتوں کی عبادت کا اصل سبب قبور اور اصحابِ قبور کے بارے میں غلو کا شکار ہونا تھا ۔ نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قبروں کو برابر کرنے اور (اونچی قبروں کو) مٹانے کا حکم دیا ہے ۔ بشر کے بارے میں غلو کرنا حرام ہے ۔'' (البدایة والنهایة لابن کثیر : ٢٨٦/١٠)

شیعوں کا ''امام غائب''!

حافظ ابنِ کثیر رحمہ اللہ شیعوں کے ''امام غائب'' اور ''مہدی منتظر'' محمد بن الحسن العسکری کے بارے میں فرماتے ہیں: ''امام مہدی نکلیں گے☆ ان کا ظہور مشرق کے علاقے سے ہوگا سامراء کی غار سے نہیں۔ جاہل رافضیوں کا خیال ہے کہ امام مہدی اس غار میں اب موجود ہیں ۔ وہ آخری زمانے میں ان کے خروج کا انتظار کر رہے ہیں ۔ یہ ایک قسم کی بے وقوفی ، بہت بڑی رسوائی ہے اور شیطان کی طرف سے شدید ہوس ہے کیونکہ اس پر کوئی دلیل و برہان نہیں ۔ نہ قرآن سے نہ سنتِ رسول سے نہ عقل سے اور نہ قیاس سے ۔'' (النهایة فی الفتن والملاحم لابن کثیر : ٥٥/١)

☆ متواتر احادیث سے اہل سنت والجماعت کا یہ عقیدہ ثابت ہے کہ امام مہدی محمد بن عبداللہ نام سے موسوم ہوں گے ، سیدہ فاطمہ r کی اولاد سے ہوں گے ، قربِ قیامت ان کا ظہور ہوگا ، وہ پوری دنیا پر عدل و انصاف کے پھریرے لہرائیں گے ۔ امام مہدی کے متعلق احادیث متواتر ہیں ۔ دیکھیں فتح الباری لابن حجر : ٤٩٣/٦، ٤٩٤، تہذیب التہذیب لابن حجر : ١٤٤/٩، فتح المغیث للسخاوی ، الحاوی للفتاوی للسیوطی : ٨٥/٢، نظم المتناثر للکتانی : ص ٤٧ وغیرہ .

کیا نبیٔ اکرم ﷺ نے اللہ تعالیٰ کو دیکھا ہے؟

غلام مصطفی ظہیر امن پوری

کیا نبی کریم ﷺ نے اللہ تعالیٰ کو دیکھا ہے؟ یہ جاننے سے پہلے کہ اس بارے ائمہ اہل سنت کا راجح موقف کیا ہے ان باتوں پر غور فرما لیں:

① کیا نبی کریم ﷺ نے معراج والی رات اللہ رب العزت کو دیکھا ہے؟

② کیا نبی کریم ﷺ نے حالتِ خواب میں اللہ تعالیٰ کو دیکھا ہے؟

③ کیا دنیا میں اللہ تعالیٰ کو دیکھا جا سکتا ہے؟

① معراج والی رات دیدارِ الٰہی:

معراج والی رات نبی کریم ﷺ نے دنیا کی ظاہری آنکھ سے دیدارِ الٰہی نہیں کیا، جیسا کہ:

(ا) سیدنا ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: **سألت رسول الله صلّى الله عليه وسلّم : هل رأيت ربّك ؟ قال : ((نور أنّى أراه))**

''میں نے رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا: کیا آپ نے اپنے ربّ کو دیکھا ہے؟ فرمایا: وہ تو نور ہے، میں اسے کیسے دیکھ سکتا ہوں۔'' (صحيح مسلم: ۹۹/۱، ح: ۱۷۸)

صحیح مسلم کی اس روایت میں **رأيت نورا** کے الفاظ بھی ہیں جن کا مطلب بیان کرتے ہوئے امام ابنِ حبان رحمہ اللہ (م ۳۵۴ھ) فرماتے ہیں:

معناه أنّه لم ير ربّه ، ولكن رآى نورا علويّا من أنوار المخلوقة .

''اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ نے اپنے ربّ کو نہیں دیکھا بلکہ مخلوق (فرشتوں) کے نوروں میں سے ایک بلند نور دیکھا تھا۔'' (صحيح ابن حبان ، تحت الحديث : ۵۸)

(ب) سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: **من حدّثك أنّ محمّدا صلّى**

اللّٰــه عـلـيــه وسـلّـم رآی ربّـه فقد كذب . ''جو آپ کو یہ بیان کرے کہ محمد ﷺ نے اپنے ربّ کو دیکھا تھا وہ جھوٹ بولتا ہے۔''

(صحیح البخاری : ۷۲۰/۲، ح : ٤٨٥٥، صحیح مسلم : ۹۸/۱، ح : ۱۷۷)

سیدنا ابنِ عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے : قد رآه النبیّ صلّی اللّٰه علیه وسلّم .
''یقیناً اللہ تعالیٰ کو نبی کریم ﷺ نے دیکھا ہے۔''(سنن الترمذی : ۳۲۸۰، وقال : حسن ، السنة لابن ابی عاصم : ۱۹۱/۱، تفسیر الطبری : ۵۲/۲۷، کتاب التوحید لابن خزیمة : ۴۹۰/۱، وسندهٗ حسنٌ)

اس قول کے بارے میں شیخ الاسلام ابنِ تیمیہ رحمہ اللہ (۶۶۱۔۷۲۸ھ) فرماتے ہیں :
لیس ذلک بخلاف فی الحقیقة ، فإنّ ابن عبّاس لم یقل : رآه بعینی رأسه .
'' دراصل یہ تعارض نہیں ہے کیونکہ سیدنا ابنِ عباس رضی اللہ عنہما نے یہ نہیں فرمایا کہ نبی کریم ﷺ نے اللہ تعالیٰ کو اپنے سر والی دو آنکھوں سے دیکھا ہے۔''

(اجتماع جیوش الاسلامیة لابن القیم : ص ٤٨)

نیز فرماتے ہیں : لیس فی الأدلّة ما یقتضی أنّه رآه بعینه ، ولا ثبت ذلک عن أحد من الصحابة ، ولا فی الکتاب والسنّة ما یدلّ علی ذلک ، بل النصوص الصحیحة علی نفیه أدلّ . ''کوئی دلیل ایسی نہیں جس کا یہ تقاضا ہو کہ آپ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ نہ یہ صحابہ کرام میں سے کسی سے ثابت ہے نہ کتاب وسنت میں کوئی ایسی دلیل ہے۔ اس کے برعکس صحیح نصوص اس کی نفی میں زیادہ واضح ہیں۔''(مجموع الفتاوی لابن تیمیة : ۵۰۹/٦، ۵۱۰)

حافظ ابنِ کثیر رحمہ اللہ (۷۰۱۔۷۷۴ھ) فرماتے ہیں : وما روی ذلک من إثبات الرؤیة بالبصر فلا یصحّ من ذلک لا مرفوعا بل ولا موقوفا ، واللّٰه أعلم . ''نبی کریم ﷺ کے اللہ تعالیٰ کو دیکھنے کے بارے میں جو کچھ منقول ہے

وہ نہ نبی کریم ﷺ سے ثابت ہے نہ صحابہ کرام سے۔" (الفصول فی سیرة الرسول : ص ٢٦٨)

نیز فرماتے ہیں: **وفی روایة عنه ـ یعنی ابن عبّاس ـ أطلق الرؤیة ، وهی محمولة علی المقیّدة بالفؤاد ، ومن روی عنه بالبصر فقد أغرب ، فإنّه لا یصحّ فی ذلک شیء من الصحابة رضی اللّٰه عنهم .** "سیدنا ابنِ عباس رضی اللہ عنہما سے ایک روایت ہے کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ کے اللہ تعالیٰ کو دیکھنے کے لفظ استعمال فرمائے ہیں۔ اُن کی یہ بات دل کے ساتھ دیکھنے سے مقیّد کی جائے گی۔ جس نے آنکھوں کے ساتھ دیکھنے والی روایت بیان کی ہے اس نے منکر بات کی ہے کیونکہ اس بارے میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے کچھ ثابت نہیں۔" (تفسیر ابن کثیر : ٢٣/٦، ٢٤)

امام ابنِ ابی العز الحنفی رحمہ اللہ (۷۳۱-۷۹۲ھ) اس بارے میں فرماتے ہیں:

وأنّ الصحیح أنّه رآه بقلبه ، ولم یر بعین رأسه ، وقوله : ﴿مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَآی﴾ (النجم : ۱۱) **﴿وَلَقَدْ رَآهُ نَزْلَةً أُخْرىٰ﴾** (النجم : ۱۳) **صحّ عن النبیّ صلّی اللّٰه علیه وسلّم أنّ هذا المرئیّ جبریل ، رآه مرّتین علی صورته الّتی خلق فیها .**

"صحیح بات یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اللہ تعالیٰ کو اپنے دل کے ساتھ دیکھا تھا، سر کی آنکھ سے نہیں دیکھا۔ فرمانِ باری تعالیٰ ﴿مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَآی﴾ (النجم : ۱۱) (دل نے جو دیکھا تھا اسے جھٹلایا نہیں) ﴿وَلَقَدْ رَآهُ نَزْلَةً أُخْرىٰ﴾ (النجم : ۱۳) (یقیناً آپ ﷺ نے اسے دوسری دفعہ دیکھا تھا) کے بارے میں نبی کریم ﷺ سے صحیح ثابت ہے کہ یہاں جس چیز کو دیکھنے کا ذکر ہے وہ جبریل علیہ السلام ہیں۔ آپ ﷺ نے جبریل علیہ السلام کو دو دفعہ اُن کی اس صورت میں دیکھا ہے جس میں وہ پیدا کیے گئے تھے۔"

(شرح العقیدة الطحاویة لابن ابی العز الحنفی : ٢٧٥/١)

نیز لکھتے ہیں: **لکن لم یرد نصّ بأنّه صلّی اللّٰه علیه وسلّم رآی ربّه بعین رأسه ، بل ورد ما یدلّ علی نفی الرؤیة .** "لیکن نبی کریم ﷺ کے

اللہ تعالیٰ کو اپنے سر کی آنکھ کے ساتھ دیکھنے کے بارے میں کوئی دلیل نہیں ملتی ، البتہ آپ ﷺ کے اللہ تعالیٰ کو نہ دیکھنے کے بارے میں دلائل ملتے ہیں ۔''

(شرح العقیدۃ الطحاویۃ لابن ابی العز الحنفی : ۲۲۲/۱)

حافظ ابنِ حجر رحمہ اللہ (۷۷۳۔۸۵۲ھ) لکھتے ہیں : **جاءت عن ابن عبّاس أخبار مطلقة ، وأخرىٰ مقيّدة ، فيجب حمل مطلقها على مقيّدها .... وعلى هذا فيمكن الجمع بين إثبات ابن عبّاس ونفي عائشة بأن يحمل على رؤية البصر ، وإثباته على رؤية القلب ، ثمّ المراد برؤية الفؤاد رؤية القلب ، لا مجرّد حصول العلم ، لأنّه صلّى اللّٰه عليه وسلّم كان عالما باللّٰه على الدوام ، بل مراد من أثبت له أنه رآه بقلبه أنّ الرؤية الّتي حصلت له خلقت في قلبه ، كما يخلق الرؤية بالعين لغيره ، والرؤية لا يشترط لها شيء مخصوص عقلا ، لو جرت العادة خلقها في العين .** ''سیدنا ابنِ عباس رضی اللہ عنہما سے کچھ روایات مطلق آئی ہیں اور کچھ مقیّد ۔ ضروری ہے کہ مطلق روایات کو مقید روایات پر محمول کیا جائے .... یوں سیدنا ابنِ عباس رضی اللہ عنہما کے اثبات اور سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی نفی میں اس طرح تطبیق ممکن ہے کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی نفی کو آنکھوں کی رؤیت پر محمول کیا جائے اور سیدنا ابنِ عباس رضی اللہ عنہما کے اثبات کو دل کی رؤیت پر محمول کیا جائے ۔ پھر دل کے دیکھنے سے دیکھنا ہی مراد ہے نہ کہ صرف جاننا ، کیونکہ نبی اکرم ﷺ ہمیشہ سے اللہ تعالیٰ کو جانتے تھے ۔ جنہوں نے نبی اکرم ﷺ کے لیے دل کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو دیکھنے کا اثبات کیا ہے ان کی مراد یہ ہے کہ جس طرح عام لوگوں کی آنکھ میں رؤیت پیدا کی جاتی ہے ایسے ہی آپ ﷺ کے دل میں رؤیت پیدا کی گئی ۔ عقلی طور پر رؤیت کے لیے کوئی خاص شرط نہیں اگرچہ عادت یہ ہے کہ یہ آنکھ میں ہی پیدا ہوتی ہے ۔''(فتح الباری لابن حجر : ٤٧٤/٨)

فائدہ : فرمانِ باری تعالیٰ : ﴿فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ أَوْ أَدْنىٰ ☆ فَأَوْحىٰ إِلىٰ عَبْدِهٖ مَا أَوْحىٰ﴾ (النجم : ١٠) [پس وہ (نبی اکرم ﷺ سے) دو کمانوں کے درمیانی فاصلے پر تھا یا اس سے بھی قریب ۔ پھر اس نے اس کے بندے کی طرف وہ وحی کی جو اس نے وحی کی تھی] سے مراد جبریل علیہ السلام ہیں ، جیسا کہ حافظ ابنِ کثیر رحمہ اللہ لکھتے ہیں :

أی : فاقترب جبريل إلى محمّد لمّا هبط عليه إلى الأرض حتّى كان بينه وبين محمّد صلّى الله عليه وسلّم قاب قوسين .

'' یعنی جب جبریل علیہ السلام ، محمد ﷺ پر زمین کی طرف اُترے تو اتنا قریب ہوئے کہ جبریل علیہ السلام اور محمد ﷺ کے درمیان دو کمانوں کے درمیانی فاصلے جتنا فاصلہ بھی نہ رہا ۔''

(تفسير ابن كثير : ٢٢/٦ بتحقيق عبد الرزاق المهدی)

نیز فرماتے ہیں : وهكذا هذه الآية : ﴿فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ أَوْ أَدْنىٰ﴾ ، وهذا الذی قلناه من أنّ هذا المقترب الدانی الّذی صار بينه وبين محمّد إنّما هو جبريل عليه السلام ، هو قول أمّ المؤمنين عائشة وابن مسعود ، وأبی ذرّ ، وأبی هريرة . '' اسی طرح یہ آیت ہے ﴿فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ أَوْ أَدْنىٰ﴾ (یعنی یہاں جبریل علیہ السلام مراد ہیں) ۔ اور ہم نے یہ جو کہا ہے کہ محمد ﷺ کے بہت زیادہ قریب ہونے والے جبریل علیہ السلام ہی تھے تو یہ ام المومنین سیدہ عائشہ ، سیدنا عبد اللہ بن مسعود ، سیدنا ابوذر اور سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم کا فرمان ہے ۔'' (تفسير ابن كثير : ٢٢/٦)

فرمانِ باری تعالیٰ : ﴿فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ أَوْ أَدْنىٰ ☆ فَأَوْحىٰ إِلىٰ عَبْدِهٖ مَا أَوْحىٰ﴾ (النجم : ٩، ١٠) کی تفسیر میں سیدنا عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں :

'' اس سے مراد جبریل علیہ السلام ہیں ۔''

(صحيح البخاری : ٧٢٠/٢، ح : ٤٨٥٦، صحيح مسلم : ٩٧/١، ح : ١٧٤)

حاصلِ کلام یہ ہے کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے جس رؤیت کی نفی کی ہے، اس کا تعلق دنیا کی ظاہری آنکھ سے ہے، یعنی ان کے مطابق وہ شخص جھوٹا ہے جو یہ دعویٰ کرتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کو اپنی ظاہری آنکھوں سے دیکھا ہے۔ سیدنا ابنِ عباس رضی اللہ عنہما جس دیکھنے کو ثابت کرتے ہیں وہ دل سے دیکھنا ہے، یعنی حالتِ نیند پر محمول ہے۔ اس طرح دونوں اقوال میں جمع وتطبیق ہو جاتی ہے۔ جو لوگ ظاہری آنکھ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اللہ تعالیٰ کو دیکھنا ثابت کرتے ہیں ان کا قول مرجوح ہے۔

فائدہ : فرمانِ باری تعالیٰ: ﴿فَأَوْحىٰ إِلىٰ عَبْدِهِ مَا أَوْحىٰ﴾ (النجم: ١٠) کے بارے میں حافظ ابنِ کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: **معناه : فأوحىٰ جبريل إلى عبد الله محمّد ما أوحىٰ ، أو أوحى الله إلى عبده محمّد ما أوحىٰ بواسطة جبريل ، وكلا المعنيين صحيح .** ''اس کا معنیٰ یہ ہے کہ جبریل نے اللہ تعالیٰ کے بندے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جو وحی کرنا تھی کر دی یا اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جو وحی کرنا تھی، جبریل کے واسطے سے کر دی۔ یہ دونوں معنیٰ درُست ہیں۔''

(تفسير ابن كثير : ٢٣/٦)

الحاصل: نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے معراج والی رات اللہ تعالیٰ کو نہیں دیکھا۔ اس کے خلاف کچھ ثابت نہیں۔ مدعی کو چاہیے کہ وہ بادلیل بات کرے۔

② نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا حالت نیند میں دیدار الٰھی :

ائمہ اہل سنت اس بات کے قائل ہیں نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حالتِ نیند میں اللہ تبارک وتعالیٰ کو دیکھا ہے۔ سیدنا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دن نمازِ صبح کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا خواب بیان کرتے ہوئے فرمایا:

فإذا أنا بربّي عزّ وجلّ في أحسن صورة . ''اچانک میں نے اپنے

ربّ کو حسین ترین صورت میں دیکھا۔''(مسند الامام احمد : ۲۴۳/۵، وسندہٗ صحیحٌ)

شیخ الاسلام ابنِ تیمیہ رحمہ اللہ (۶۶۱۔۷۲۸ھ) اس بارے میں فرماتے ہیں :

ولكن لم يكن هذا في الإسراء ، ولكن كان في المدينة لما احتبس عنهم في صلاة الصبح ، ثمّ أخبرهم عن رؤية ربّه تبارك وتعالىٰ تلك الليلة في منامه ، وعلى هذا بنى الإمام أحمد رحمه اللّٰه تعالىٰ ، وقال : نعم رآه حقّا ، فإنّ رؤيا الأنبياء حقّ ، ولا بدّ . ''یہ دیکھنا معراج والے واقعے میں نہیں بلکہ مدینہ منورہ میں تھا جب آپ ﷺ صبح کی نماز میں آنے سے لیٹ ہو گئے تھے۔ پھر آپ ﷺ نے صحابہ کرام کو اس رات اللہ تعالیٰ کو نیند میں دیکھنے کے بارے میں بتایا۔اسی بنا پر امام احمد رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ضرور اللہ تعالیٰ کو دیکھا ہے کیونکہ انبیائے کرام کے خواب یقیناً وحی ہوتے ہیں۔''(زاد المعاد لابن القیم : ۳۷/۳)

نیز فرماتے ہیں : **فعلم أنّ هذا الحديث كان رؤيا منام بالمدينة ، لم يكن رؤيا يقظة ليلة المعراج .**

''معلوم ہوا کہ یہ واقعہ مدینہ منورہ میں نیند کے دوران کا ہے،معراج کی رات بیداری کا نہیں۔''(مجموع الفتاوی : ۳۸۷/۳، ۳۸۸)

③ کسی نے دنیا میں اللّٰہ تعالیٰ کو نہیں دیکھا :

کسی نے دنیا میں اللہ تعالیٰ کو نہیں دیکھا۔ یہ اہل سنت والجماعت کا اتفاقی و اجماعی عقیدہ ہے،جیسا کہ امام عثمان بن سعید دارمی رحمہ اللہ (۲۰۰۔۲۸۰ھ) فرماتے ہیں :

جميع الأئمّة يقولون به : إنّه لم ير ، ولا يرى في الدنيا .

''تمام ائمہ کرام یہی کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو دنیا میں نہ دیکھا گیا نہ دنیا میں اسے دیکھا جا سکتے گا۔''(الرد علی الجهمية للدارمی : ۱۲۴)

شیخ الاسلام ابنِ تیمیہ رحمہ اللہ (۶۶۱۔۷۲۸ھ) فرماتے ہیں:
وقد اتّفق المسلمون على أنّ النبيّ صلّى اللّٰه عليه وسلّم لم ير ربّه بعينه في الأرض . ''مسلمانوں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ نبیٔ اکرم ﷺ نے زمین میں اپنی آنکھوں سے اللہ تعالیٰ کو نہیں دیکھا۔'' (مجموع الفتاوی لابن تیمیة : ۳/۳۸۸)

امام ابنِ ابی العز الحنفی رحمہ اللہ (۷۳۱۔۷۹۲ھ) لکھتے ہیں: **واتّفقت الأمّة على أنه لا يراه أحد في الدنيا بعينه .**
''امتِ مسلمہ نے اس بات پر اتفاق کیا ہے کہ دنیا میں کوئی اپنی آنکھوں سے اللہ تعالیٰ کو نہیں دیکھ سکتا۔'' (شرح العقیدة الطحاویة لابن ابی العز الحنفی : ۱/۲۲۲)

رسول اللہ ﷺ کا فرمانِ گرامی ہے: **((تعلّموا أنه لن يرى أحد منكم ربّه عزّ وجلّ حتّى يموت))** ''جان لو کہ تم میں سے کوئی بھی مرنے سے پہلے اللہ تعالیٰ کو نہیں دیکھ سکتا۔'' (صحیح مسلم : ۲/۳۹۹، ح : ۱۶۹)

سیدنا ابوامامہ باہلی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں دجال کے بارے میں خطبہ دیا اور فرمایا:
((فيقول : أنا ربّكم ، ولن تروا ربّكم حتّى تموتوا))
''وہ کہے گا کہ میں تمہارا ربّ ہوں ، حالانکہ تم موت سے پہلے اپنے ربّ کو نہیں دیکھ سکتے۔'' (السنة لابن ابی عاصم : ۴۰۰، وسندہٗ حسنٌ ، عمرو بن عبد اللّٰه الحضرمی وثقة العجلی وابن حبان فهو موثق حسن الحدیث)

الحاصل : نبی کریم ﷺ نے معراج والی رات اللہ تعالیٰ کو نہیں دیکھا۔ البتہ مدینہ منورہ میں حالتِ نیند میں اللہ تعالیٰ کا دیدار کیا ہے۔

❁❁❁❁❁❁❁

نبیٔ اکرم ﷺ کا خون کسی صحابی نے نہیں پیا

غلام مصطفی ظہیر امن پوری

کسی صحابی سے رسول اللہ ﷺ کا خون پینا باسندِ صحیح ثابت نہیں۔ جو لوگ ایسا دعویٰ کرتے ہیں، ان کے دلائل پر مختصر اور جامع تبصرہ پیشِ خدمت ہے:

دلیل نمبر ① : سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جنگِ احد کے دن نبیٔ اکرم ﷺ کی پیشانی مبارک پر زخم آ گیا۔ آپ ﷺ کے پاس سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کے والد مالک بن سنان رضی اللہ عنہ آئے۔ انہوں نے نبیٔ کریم ﷺ کے چہرۂ مبارک سے خون صاف کیا اور پھر اس خون کو نگل لیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

من سرّہ أن ینظر إلی من خالط دمی دمه فلینظر إلی مالک بن سنان .

''جو شخص پسند کرتا ہے کہ وہ اس شخص کو دیکھے جس کے خون کے ساتھ میرا خون مل چکا ہے تو وہ مالک بن سنان کو دیکھ لے۔'' (المستدرك علی الصحیحین للحاکم : ۵۶۳/۳، ۵۶۴، المعجم الکبیر للطبرانی : ۳٤/٦)

تبصرہ : یہ روایت ''ضعیف'' ہے۔ حافظ ذہبی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

إسنادہ مظلم . ''اس کی سند سخت اندھیری ہے۔''

(تلخیص المستدرك للذہبی : ۵٦٤/۳)

اس کی سند کا حال ملاحظہ فرمائیں:

① اس کا راوی موسیٰ بن محمد بن علی الجمی ''مجہول'' ہے۔

امام ابوحاتم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ شیخ مدینی ہے، کسی نے اس کو ثقہ نہیں کہا۔

② ام سعد بنت مسعود بن حمزہ بن ابی سعید کی توثیق مطلوب ہے۔

③ ام عبدالرحمٰن بنت ابی سعید کی توثیق و حالات نہیں ملے۔

دلیل نمبر ② : سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ان کے والد مالک بن سنان رضی اللہ عنہ غزوۂ احد میں نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زخم مبارک کو چاٹنے اور چوسنے لگے، جس سے زخم کی جگہ چمکنے لگی۔ ان سے کہا گیا کہ کیا تم خون پی رہے ہو؟ انہوں نے کہا: ہاں! میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خون پی رہا ہوں۔ نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

خالط دمی بدمه ، لا تمسّه النار . ''اس کے خون کے ساتھ میرا خون مل گیا ہے۔ اس کو آگ کبھی نہیں چھوئے گی۔''

(المعجم الاوسط للطبرانی : ۴۷/۹، رقم الحدیث : ۹۰۹۸)

تبصرہ : اس روایت کی سند ''ضعیف'' ہے، کیونکہ:

① امام طبرانی کے استاذ مسعدۃ بن سعد العطار ابو القاسم المکی کی کوئی توثیق نہیں مل سکی۔

② اس میں مصعب بن الاسقع راوی ''مجہول'' ہے۔

③ العباس بن ابی شملہ راوی کو امام ابنِ حبان رحمہ اللہ، جو کہ متساہل ہیں، نے اپنی کتاب ''الثقات'' میں ذکر کیا ہے۔ امام ابوحاتم الرازی رحمہ اللہ نے اسے ''ضعیف'' کہا ہے۔

(الجرح والتعدیل لابن ابی حاتم : ۲۲۸/۷)

لہٰذا یہ راوی ''ضعیف'' ہے۔

دلیل نمبر ③ : عامر بن عبداللہ بن زبیر اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سنگی لگوائی۔ مجھے حکم دیا کہ میں اس خون کو ایسی جگہ چھپا دوں جہاں سے درندے، کتے (وغیرہ) یا کوئی انسان نہ پا سکے۔ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے دُور چلا گیا اور دُور جا کر اس خون کو پی لیا۔ پھر

میں آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ ﷺ نے پوچھا: آپ نے خون کا کیا کیا؟ میں نے عرض کی: میں نے ویسے ہی کیا ہے جیسے آپ نے حکم دیا تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: میرے خیال میں آپ نے اسے پی لیا ہے۔ میں نے عرض کیا: جی ہاں! آپ ﷺ نے فرمایا: اب آپ سے میرا کوئی امتی بغض و کینہ سے نہیں ملے گا۔

(السنن الکبری للبیهقی: ٦٧/٧، وصححه المقدسی: ٣٠٨/٩)

تبصرہ: اس روایت کی سند ''ضعیف'' ہے۔ اس کا راوی الهنید بن قاسم بن عبدالرحمٰن ''مجہول'' ہے۔ متقدمین ائمہ محدثین میں سے کسی نے اس کی توثیق نہیں کی۔ لہٰذا حافظ ہیثمی رحمہ اللہ (مجمع الزوائد: ٢٧٠/٨) کا اس کو ثقہ قرار دینا اور حافظ ابنِ حجر رحمہ اللہ (التلخیص الحبیر: ٣٠/١) کا ''ولا بأس بہ'' کہنا صحیح نہیں۔

ایک روایت میں ہے: **لعلک شربته ؟ قال : نعم ، قال : ولم شربت الدم ؟ ويل للناس منک ، وويل لک من الناس .**

''آپ ﷺ نے فرمایا: شاید آپ نے پی لیا ہے۔ صحابی نے عرض کیا: جی ہاں! آپ ﷺ نے فرمایا: آپ نے خون کیوں پیا؟ نیز فرمایا: لوگ آپ سے محفوظ ہو گئے اور آپ لوگوں سے محفوظ رہیں گے۔''

اس کی سند میں وہی الهنید بن قاسم راوی ''مجہول'' ہے۔

ایک روایت میں ہے: **لا تمسّک النار إلا قسم اليمين .**

''آپ کو آگ صرف قسم پوری کرنے کے لیے چھوئے گی۔''

(حلیة الاولیاء لابی نعیم الاصبهانی: ٣٣٠/١، جزء الغطریف: ٦٥، تاریخ دمشق لابن عساکر: ٢٣٣/٢٠، ١٦٢/٢٨، ١٦٣، الاصابة فی تمییز الصحابة لابن حجر: ٩٣/٤)

تبصرہ: اس کی سند سخت ترین ''ضعیف'' ہے۔ اس کے راوی سعد ابو

عاصم مولیٰ سلیمان بن علی اور کیسان مولیٰ عبداللہ بن الزبیر کی توثیق نہیں مل سکی ، لہٰذا یہ سند مردود و باطل ہے۔

اسماء بنت ابی بکر کی روایت میں ہے: **لا تمسّک النار ، ومسح علی رأسه .** ''نبیٔ اکرم ﷺ نے سیدنا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے سر پر ہاتھ پھیرا اور فرمایا کہ آپ کو آگ ہرگز نہ چھوئے گی۔(سنن الدارقطنی : ۲۲۸/۱)

تبصرہ : اس کی سند سخت ''ضعیف'' ہے، کیونکہ:

① اس کا راوی محمد بن حمید الرازی ''ضعیف'' ہے۔(تقریب التهذیب : ۵۸۳٤)

② اس کا راوی علی بن مجاہد بھی ''ضعیف'' ہے۔ حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے اسے کذاب قرار دیا ہے۔(المغنی فی الضعفاء : ۹۰۵/۲)

حافظ ابنِ حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: **متروک ، ولیس فی شیوخ أحمد أضعف منه .** ''یہ متروک راوی ہے۔امام احمد رحمہ اللہ کے اساتذہ میں اس سے بڑھ کر ضعیف کوئی نہ تھا۔''(تقریب التهذیب : ٤۷۹۰)

نیز حافظ ابنِ حجر رحمہ اللہ نے اسے ''ضعیف'' بھی کہا ہے۔(التلخیص الحبیر : ۳۱/۱)

علی بن مجاہد کے بارے میں امام یحییٰ بن ضُریس کہتے ہیں کہ یہ پرلے درجے کا جھوٹا راوی ہے۔(الجرح والتعدیل لابن ابی حاتم : ۲۰۵/٦، وسندہٗ حسنٌ)

ابوغسان محمد بن عمرو کہتے ہیں: **ترکته ، ولم یرضه .** ''میں نے اسے چھوڑ دیا۔ وہ اس سے راضی نہیں تھے۔''(الضعفاء للعقیلی : ۲۵۲/۳، وسندہٗ صحیحٌ)

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ اس کے بارے میں فرماتے ہیں:

کتبنا عنه ، ما أری به بأسا . ''ہم نے اس سے لکھا ہے، میں اس میں کوئی حرج خیال نہیں کرتا۔''(سوالات ابی داؤد لاحمد : ۵٦۳)

امام ابنِ حبان رحمہ اللہ نے اسے ''الثقات'' میں ذکر کیا ہے۔

یہ دونوں قول مرجوح ہیں ۔ امام ابنِ حبان ویسے ہی متساہل ہیں ۔ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کا قول جمہور کے مقابلے میں مرجوح ہے، جیسا کہ حافظ ذہبی رحمہ اللہ اور حافظ ابنِ حجر رحمہ اللہ کی جرح سے معلوم ہوا ہے ۔

جریر بن عبدالحمید کہتے ہیں کہ وہ میرے نزدیک ثقہ ہے ۔ (سنن الترمذی : ۵۹)

لیکن اس قول کی سند میں محمد بن حمید الرازی ''ضعیف'' ہے، لہٰذا یہ قول ثابت نہیں ۔

③ اس کے تیسرے راوی رباح النوبی کے بارے میں حافظ ذہبی رحمہ اللہ لکھتے ہیں : لیّنه بعضهم ، ولا یُدری من هو . ''اسے بعض محدثین نے ضعیف قرار دیا ہے، نہ معلوم یہ کون ہے؟'' (میزان الاعتدال للذهبی : ۳۸/۲)

دلیل نمبر ④ : سیدنا سفینہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سنگی لگوائی اور مجھے حکم دیا کہ یہ خون لے جاؤ اور اسے ایسی جگہ دفن کر دو جہاں پرندے، چوپائے اور انسان نہ پہنچ سکیں ۔ کہتے ہیں کہ میں ایک جگہ چھپ گیا اور اسے پی لیا ۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے پوچھا یا آپ کو بتایا گیا کہ میں نے اسے پی لیا ہے ۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مسکرا دیئے ۔ (التاریخ الکبیر للبخاری : ۲۰۹/٤، ترجمة : ۲۵۲٤، السنن الکبری للبیهقی : ٦۷/۷، شعب الایمان للبیهقی : ۲۳۳/۵، ح : ٦٤۸۹، المعجم الکبیر للطبرانی : ۸۱/۷، ح : ٦٤۳٤، التاریخ الکبیر لابن ابی خیثمة : ۳۰۸۸)

تبصرہ : اس کی سند ''ضعیف'' ہے ۔ امام بخاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں :

فی إسناده نظر . ''اس کی سند محلِ نظر ہے ۔''

اس کی سند میں بریہ بن عمر بن سفینہ راوی جمہور کے نزدیک ''ضعیف'' ہے ۔ امام عقیلی رحمہ اللہ لکھتے ہیں : لا یتابع علی حدیثه . ''اس کی حدیث پر متابعت نہیں کی گئی ۔'' (الضعفاء للعقیلی : ۱٦۷/۱)

حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے اس کو ''لیّن'' کہا ہے۔(الکاشف للذہبی : ۹۹/۱)

امام ابنِ حبان رحمہ اللہ فرماتے ہیں : **یخالف الثقات فی الروایات ، فلا یحلّ الاحتجاج بخبرہ بحال .** ''یہ روایات میں ثقہ راویوں کی مخالفت کرتا ہے۔ کسی حال میں بھی اس کی روایت سے حجت لینا حلال نہیں۔''

(المجروحین لابن حبان : ۱۱۱/۱)

نیز ''الثقات'' میں لکھتے ہیں : **کان ممّن یخطئ ویخالف .**

''یہ ان راویوں میں سے ہے جو خطا کھاتے اور ثقہ راویوں کی مخالفت کرتے ہیں۔''

امام ابنِ عدی رحمہ اللہ لکھتے ہیں : **لا یتابعه علیها الثقات ، وأرجو أنّه لا بأس به .** ''اس کی روایات پر ثقہ راوی متابعت نہیں کرتے۔ میں امید کرتا ہوں کہ اس میں کوئی حرج نہیں۔''(الکامل فی ضعفاء الرجال لابن عدی : ۶۴/۲)

یہ قول جمہور کے مخالف ہے ، نیز یہ واضح توثیق بھی نہیں۔ اس راوی کی دوسری روایات پر بھی محدثین کرام نے جرح کر رکھی ہے، لہٰذا یہ ''ضعیف'' راوی ہے۔

دلیل نمبر ⑤ : سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ایک قریشی لڑکے نے نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو سنگی لگائی۔ جب وہ اس سے فارغ ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا خون لے کر دیوار کے پیچھے چلا گیا۔ پھر اس نے اپنے دائیں بائیں دیکھا۔ جب اسے کوئی نظر نہ آیا تو اس نے وہ خون پی لیا۔ جب واپس لوٹا تو نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے چہرے کی طرف دیکھ کر پوچھا: اللہ کے بندے! آپ نے اس خون کا کیا کیا؟ اس نے عرض کیا: میں نے دیوار کے پیچھے اسے چھپا دیا ہے۔ آپ نے فرمایا: کہاں چھپایا ہے؟ اس نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! میں نے زمین پر آپ کا خون گرانا مناسب نہیں سمجھا تو وہ میرے پیٹ میں ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جاؤ تم نے خود کو جہنم سے بچا لیا۔

(المجروحین من المحدثین لابن حبان : ۵۹/۳، التلخیص الحبیر لابن حجر : ۱۱۱/۱)

تبصرہ : یہ جھوٹ کا پلندا ہے ۔امام ابنِ حبان رحمہ اللہ فرماتے ہیں :

''اس کے راوی نافع السلمی ابو ہرمز بصری نے امام عطاء بن ابی رباح رحمہ اللہ کی طرف منسوب ایک جھوٹا نسخہ روایت کیا تھا۔'' پھرانہوں نے اس سے یہ حدیث ذکر کی ۔

اس راوی کے متعلق امام یحییٰ بن معین رحمہ اللہ فرماتے ہیں :

ليس بثقة ، كذّاب . ''یہ ثقہ نہیں ۔ پرلے درجے کا جھوٹا ہے ۔''

(الكامل لابن عدی : ٤٩/٧، وسندهٗ حسنٌ)

یہ بالاتفاق ضعیف اور متروک راوی ہے ۔ اس کے بارے میں ادنیٰ کلمہ توثیق بھی ثابت نہیں ہے ۔

دلیل نمبر ⑥ : سالم ابو ہند الحجام کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سنگی لگائی اور سنگی سے بہنے والا کون پی لیا اور عرض کی : اے اللہ کے رسول! میں نے یہ خون پی لیا ہے ۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **ويحك يا سالم ! أما علمت أنّ الدم حرام ، لا تعد .** ''اے سالم ! آپ ہلاک ہو جائیں ۔کیا آپ کو علم نہیں کہ خون حرام ہے؟ آئندہ ایسا مت کیجئے گا ۔''(معرفة الصحابة للاصبهانى : ٣٠٤٤)

تبصرہ : اس روایت کی سند ''ضعیف'' ہے ۔ابو الحجاف داؤد بن ابی عوف راوی کا سالم رضی اللہ عنہ سے سماع و لقاء ثابت نہیں ۔ حافظ ابنِ حجر رحمہ اللہ نے اس کو طبقہ سادسہ (چھٹے طبقہ) میں ذکر کیا ہے ۔اس طبقہ کے راوی کا کسی صحابی سے ملنا ممکن نہیں ۔ اس میں ایک اور علت بھی ہے ، لہٰذا یہ روایت اصولِ محدثین کے مطابق سخت ''منقطع'' اور ''ضعیف'' ہے ۔

الحاصل : کسی صحابی سے نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا خون پینا ثابت نہیں ۔

کیا کسی صحابی سے نبیٔ اکرم ﷺ کا پیشاب پینا ثابت ہے؟

غلام مصطفےٰ ظہیر امن پوری

اُمّ ِ ایمن رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ایک رات نبیٔ اکرم ﷺ مٹی کے برتن کے پاس اُٹھ کر تشریف لائے اور اس میں پیشاب کیا۔ اسی رات میں اُٹھی اور مجھے پیاس لگی ہوئی تھی۔ میں نے جو اس میں تھا، پی لیا۔ جب صبح ہوئی تو میں نے رسول اللہ ﷺ کو اس واقعہ کی خبر دی تو آپ ﷺ نے فرمایا: **أما إنک لا یتجعن بطنک أبدا .**

''خبردار! بے شک آپ آج کے بعد کبھی اپنے پیٹ میں بیماری نہ پاؤ گی۔''

(المستدرک علی الصحیحین للحاکم : ٦٣/٤، ٦٤، حلیة الاولیاء لابی نعیم الاصبهانی : ٦٧/٢، دلائل النبوة لابی نعیم الاصبهانی : ٣٨٠/٢، ٣٨١، المعجم الکبیر للطبرانی : ٨٩/٢٥، ٩٠، التلخیص الحبیر لابن حجر : ٣١/١، البدایة والنهایة لابن کثیر : ٣٢٦/٥، الاصابة فی تمییز الصحابة لابن حجر : ٤٣٣/٤)

تبصرہ : اس کی سند سخت ''ضعیف'' ہے۔اس کا راوی عبد الملک بن حسین ابو مالک النخعی ''متروک'' ہے۔(تقریب التهذیب لابن حجر : ٨٣٣٧)

تنبیہ : ابو یعلیٰ کی سند میں ابو مالک نخعی کا واسطہ گر گیا ہے۔اس پر قرینہ یہ ہے کہ ابو مالک نخعی کے استاذوں میں یعلیٰ بن عطاء اور یعلیٰ بن عطاء کے شاگردوں میں ابو مالک نخعی موجود ہے، جبکہ یعلیٰ بن عطاء کے شاگردوں میں حسین بن حرب موجود نہیں۔اس سند کے دو راوی مسلم بن قتیبہ اور الحسین بن حرب کا تعین اور توثیق درکار ہے۔

اس پر دوسرا قرینہ یہ ہے کہ حافظ سیوطی لکھتے ہیں : **وأخرج أبو یعلیٰ والحاکم والدارقطني وأبو نعیم عن أم أیمن .** ''ابو یعلیٰ، حاکم، دارقطنی اور ابو نعیم نے اسے ام ایمن سے بیان کیا ہے۔''(الخصائص الکبری للبیهقی : ٢٥٢/٢)

حافظ سیوطی یہ باور کرا رہے ہیں کہ یہ سند ایک ہی ہے جس کا دار و مدار ابو مالک نخعی پر ہے جو کہ متروک ہے، نیز الولید بن عبد الرحمٰن کا ام ایمن سے سماع بھی درکار ہے۔
ابو یعلیٰ کے علاوہ باقی سب میں نبیح العنزی اور ام ایمن کے درمیان انقطاع بھی ہے۔

تنبیہ : ایک روایت میں ہے: فما مرضت قطّ حتّی کانت مرضها الذی ماتت فیه . ''تو اس کے بعد خاتون مرض الموت تک کبھی بیمار نہیں ہوئی۔'' (التلخيص الحبير لابن حجر : ۳۲/۱)

اس کی سند سخت ''منقطع'' اور ''مدلّس'' ہے۔ اس میں امام عبد الرزاق اور امام ابنِ جریج دونوں ''مدلّس'' ہیں۔ اور مخبر نامعلوم و مجہول ہے۔

فائدہ جلیلہ : امیمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے:

إنّ النبیّ صلّی اللّٰه علیه وسلّم کان له قدح من عیدان یبول فیه ، ثمّ یوضع تحت سریره ، فجاء ت امرأة یقال لها برکة ، جاء ت مع أمّ حبیبة من الحبشة ، فشربته برکة ، فسألها ، فقالت : شربته ، فقال : لقد احتضرتی من النار بحضار ، أو قال : جُنَّة ، أو هذا معناه .

''نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لکڑی کا ایک پیالا تھا جس میں آپ پیشاب کرتے تھے، پھر اسے چارپائی کے نیچے رکھ دیا جاتا۔ ایک برکۃ نامی عورت آئی۔ وہ سیدنا ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ حبشہ سے آئی تھی۔ اس نے وہ پیالا نوش کر لیا۔ سیدنا زینب رضی اللہ عنہا نے اس سے پوچھا تو اس نے کہا: میں نے اسے پی لیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تو نے آگ سے بچاؤ حاصل کر لیا ہے یا فرمایا ڈھال بنا لی ہے یا اس طرح کی کوئی بات کہی۔''

(الآحاد والمثانی لابن ابی عاصم : ۳۳۴۲، وسندهٗ حسنٌ ، الاستیعاب فی معرفة الصحابة لابن عبد البر : ۲۵۱/٤، وسندهٗ حسنٌ ، المعجم الکبیر للطبرانی : ۱۸۹/۲٤، السنن الکبری

للبیھقی : ٦٧/٧، وسندہٗ صحیحٌ)

غالباً یہ کام اس لونڈی سے غلطی سے سرزد ہو گیا تھا اور غلطی سے ایک ناپسندیدہ کام کرنے پر جو کراہت اور تکلیف بعد میں اسے ہوئی اس کے عوض میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسے جہنم سے آزادی مل گئی کیونکہ مؤمن کی کوئی مشقت و تکلیف نیکی سے خالی نہیں ہوتی۔ واللہ اعلم بالصواب !

تنبیہ : ابو رافع کی بیوی سلمیٰ نے نبیٔ اکرم ﷺ کے غسل سے بچا ہوا پانی پی لیا تو آپ ﷺ نے اس کو فرمایا: **حرّم اللّٰہ بدنک علی النار .**

''اللہ تعالیٰ تیرے بدن کو آگ پر حرام کرے۔''(مجمع الزوائد : ٤٨٣/٨)

حافظ ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: **ورواہ الطبرانی فی الأوسط ، وفیہ معمر بن محمّد ، وھو کذّاب .** ''اسے امام طبرانی نے اپنی کتاب الاوسط میں بیان کیا ہے۔ اس میں معمر بن محمد راوی ہے اور وہ کذاب ہے۔''

(مجمع الزوائد : ٢٧٠/٨)

حافظ ابنِ حجر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: **وفی السند الضعف .**

''اس کی سند میں کمزوری ہے۔''(التلخیص الحبیر لابن حجر : ٣٢/١)

نبیٔ اکرم ﷺ کے فضلات کے پاک ہونے پر کوئی دلیلِ شرعی نہیں۔ لیکن جناب زکریا تبلیغی دیوبندی صاحب لکھتے ہیں: ''حضور کے فضلات ، پاخانہ ، پیشاب ، وغیرہ سب پاک ہیں۔''(تبلیغی نصاب از زکریا : ١٨٥)

اس بے دلیل اور غلو آمیز دعویٰ کے ردّ میں جناب اشرف علی تھانوی دیوبندی صاحب کا قول بھی سن لیں۔ وہ کہتے ہیں: ''طہارت (پاک ہونے) کا دعویٰ بلا دلیل ہے۔''

(بواد النوادر از تھانوی : ٣٩٣)

''حسن'' حدیث کے مبحث میں امام ترمذی رحمہ اللہ کی اصطلاحِ ''حسن'' ایک معرکۃ الآراء قول کی حیثیت رکھتی ہے۔ اُصولِ حدیث یا فنِ حدیث کے بیان میں جن لوگوں نے حدیثِ ''حسن'' کے بارے میں ذرا بھی تفصیلی بات کی ہے، لازماً اس ضمن میں امام ترمذی رحمہ اللہ کی اصطلاحِ ''حسن'' کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ اگرچہ امام ترمذی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب العلل الصغیر میں اپنی اصطلاحِ ''حسن'' کی وضاحت بھی کی ہے لیکن پھر بھی اس کے سمجھنے میں علمائے کرام کے اقوال مختلف ہو گئے ہیں۔

یہ بات تو سب کو تسلیم ہے کہ اگر خود قائل اپنی کسی بات کی قولی یا فعلی تشریح کر دے تو دوسرے لوگوں کے بیان کیے گئے مفہوم کے مقابلے میں وہی معتبر ہوتی ہے۔ اس مختصر مضمون میں ہم جامع ترمذی میں خود امام ترمذی رحمہ اللہ کے طرزِ عمل کی روشنی میں ان کی اصطلاحِ ''حسن'' کا صحیح معنیٰ و مفہوم قارئین کی نظر کریں گے۔

سب سے پہلے تو ہم وہ تعریف ذکر کرتے ہیں جو خود امام ترمذی رحمہ اللہ نے اپنی اصطلاحِ ''حسن'' کے بارے میں ذکر کی ہے، فرماتے ہیں:

وَمَا ذَكَرْنَا فِي هٰذَا الْكِتَابِ : حَدِيثٌ حَسَنٌ ، فَإِنَّمَا أَرَدْنَا بِهِ حُسْنَ إِسْنَادِهِ، عِنْدَنَا كُلُّ حَدِيثٍ يُرْوىٰ، لَا يَكُونُ فِي إِسْنَادِهِ مَنْ يُتَّهَمُ بَالْكِذْبِ، وَلَا يَكُونُ الْحَدِيثُ شَاذًّا، وَيُرْوىٰ مِنْ غَيْرِ وَجْهٍ نَحْوَ ذَاكَ فَهُوَ عِنْدَنَا حَدِيثٌ حَسَنٌ .

''ہم نے اس کتاب میں حدیثِ حسن کی جو اصطلاح ذکر کی ہے، اس سے مراد سند کا حسن ہونا ہے۔ ہمارے نزدیک ہر وہ حدیث جس کی سند میں نہ کوئی راوی متہم بالکذب ہو نہ وہ حدیث شاذ ہو، نیز وہ اسی طرح کی اور سند سے بھی مروی ہو، وہ حدیث حسن ہے۔''

(العلل الصغير للترمذي مندرجة في آخر جامع الترمذي : ص ٨٩٨، طبع دار السلام بالرياض)

اس تعریف میں امام ترمذی رحمہ اللہ نے اپنی اصطلاحِ ''حسن'' میں تین شرائط ذکر کی ہیں:

① اس کی سند میں کوئی متہم بالکذب راوی نہ ہو۔

② وہ حدیث شاذ نہ ہو۔

③ اس کی سندیں ایک سے زائد ہوں۔

جس شرط کی بنا پر اس تعریف کو سمجھنے میں اختلاف واقع ہوا ہے، وہ تیسری شرط ہے۔ اس شرط میں مذکور ایک سے زائد سندوں کا کیا مطلب ہے؟ اس بارے میں مختلف خیالات کی وجہ سے بعد والے محققین کی آراء مختلف ہوئی ہیں۔ بعض لوگوں کے خیال میں اس سے مراد کسی حدیث کی ایک سے زائد ایسی کمزور سندیں ہیں جن سب میں تھوڑی تھوڑی کمزوری ہوتی ہے لیکن ان زیادہ سندوں کی وجہ سے وہ حدیث قابل حجت ''حسن'' بن جاتی ہے۔ لیکن یہ بات دلائل کی رُو سے درُست نہیں۔ خود امام ترمذی رحمہ اللہ نے جو منہج جامع ترمذی میں ''حسن'' کے حوالے سے اپنایا ہے، وہ بھی اس نظریے کو سختی سے مسترد کرتا ہے۔

امام ترمذی رحمہ اللہ کی طرف سے ''حسن'' کی تعریف اور جامع ترمذی رحمہ اللہ میں اس کے اطلاق کا مطالعہ کرنے سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ امام صاحب کی ایک خاص اصطلاح ہے جو عام محدثین سے مختلف ہے۔ تعریف میں عِنْدَنَا (ہمارے نزدیک) کے الفاظ اس بات کی واضح دلیل ہیں۔ اگر اس سے محدثین کرام والی ''حسن'' جو کہ قابل حجت ہوتی ہے، مراد ہوتی تو اس تعریف میں اپنے لیے خصوصیت کا تذکرہ نہ ہوتا بلکہ سرے سے اس وضاحت کی ہی ضرورت نہ ہوتی۔ اس ہمارے دعوے پر جامع ترمذی میں امام صاحب کے بہت سے اطلاقاتِ حسن بھی ہمارے لیے دلیل ہیں۔ ہم اس سلسلے میں صرف وہ مقامات زیر بحث لائیں گے جہاں امام صاحب نے صرف حَدِيثٌ حَسَنٌ کہا ہے، کیونکہ حَدِيثٌ حَسَنٌ غَرِيبٌ اور حَدِيثٌ حَسَنٌ صَحِيحٌ میں تو شاید کوئی اور احتمال ہو سکتا ہو اور بعض محققین نے اس طرف اشارہ بھی کیا ہے کہ جب امام ترمذی رحمہ اللہ صرف ''حسن'' کہیں تو ان کی یہ مراد ہو گی ورنہ نہیں۔ لہٰذا آیئے اس مسئلے کی تحقیق کی غرض سے جامع ترمذی سے صرف ''حسن'' کی ایک دو مثالیں ملاحظہ کرتے ہیں:

① امام ترمذی رحمہ اللہ نے سب سے پہلے جو حَدِيثٌ حَسَنٌ کا اطلاق کیا ہے، وہ

ملاحظہ فرمائیں ۔امام صاحب سر پر مسح کی احادیث ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

بَابُ مَا جَاءَ فِی مَسْحِ الرَّأْسِ أَنَّهُ یُبْدَأُ بِمُقَدَّمِ الرَّأْسِ إِلیٰ مُؤَخَّرِهِ .

''اس حدیث کا بیان جس میں یہ ذکر ہے کہ سر کے مسح کو سر کے اگلے حصے سے شروع کیا جائے گا۔'' ...... عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ زَیْدٍ : أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَسَحَ رَأْسَهُ بِیَدَیْهِ، فَأَقْبَلَ بِهِمَا وَأَدْبَرَ، بَدَأَ بِمُقَدَّمِ رَأْسِهِ ثُمَّ ذَهَبَ بِهِمَا إِلیٰ قَفَاهُ، ثُمَّ رَدَّهُمَا حَتّیٰ رَجَعَ إِلَی الْمَكَانِ الَّذِی بَدَأَ مِنْهُ، ثُمَّ غَسَلَ رِجْلَیْهِ. قَالَ أَبُو عِیسیٰ : وَفِي الْبَابِ عَنْ مُعَاوِیَةَ وَالْمِقْدَامِ بْنِ مَعْدِیكَرِبَ وَعَائِشَةَ، قَالَ أَبُو عِیسیٰ : حَدِیثُ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ زَیْدٍ أَصَحُّ شَيْءٍ فِي هٰذَا الْبَابِ وَأَحْسَنُ، وَبِهِ یَقُولُ الشَّافِعِيُّ وَأَحْمَدُ وَإِسْحَاقُ . ''سیدنا عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اپنے سر کا دونوں ہاتھوں کے ساتھ یوں مسح فرماتے کہ اپنے سر کے اگلے حصے سے شروع کرتے حتی کہ دونوں ہاتھوں کو اپنی گدی مبارک تک لے جاتے ۔ پھر ان کو واپس لوٹاتے حتی کہ اس جگہ تک آ جاتے جہاں سے مسح شروع کیا تھا، پھر اپنے پاؤں مبارک دھوتے ۔ اس مسئلے میں سیدنا معاویہ، سیدنا مقدام بن معدیکرب اور سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہم سے احادیث مروی ہیں ۔ سیدنا عبد اللہ بن زید رضی اللہ عنہ کی حدیث اس (سر کے مسح کے) مسئلے میں صحیح ترین اور بہترین ہے ۔ امام شافعی، امام احمد بن حنبل اور امام اسحاق بن راہویہ رحمہم اللہ کا مذہب اسی حدیث کے مطابق ہے ۔''

اس کے بعد فرماتے ہیں : بَابُ مَا جَاءَ أَنَّهُ یُبْدَأُ بِمُؤَخَّرِ الرَّأْسِ .

''اس حدیث کا بیان جس میں یہ ذکر ہے کہ سر کا مسح سر کے پچھلے حصے سے شروع کیا جائے گا۔'' پھر امام صاحب یہ حدیث بیان فرماتے ہیں :

...... عَنِ الرُّبَیِّعِ بِنْتِ مُعَوِّذِ بْنِ عَفْرَاءَ : أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَسَحَ بِرَأْسِهِ مَرَّتَیْنِ بَدَأَ بِمُؤَخَّرِ رَأْسِهِ ثُمَّ بِمُقَدَّمِهِ وَبِأُذُنَیْهِ كِلْتَیْهِمَا ظُهُورِهِمَا وَبُطُونِهِمَا . قَالَ أَبُو عِیسیٰ : هٰذَا حَدِیثٌ حَسَنٌ، وَحَدِیثُ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ زَیْدٍ أَصَحُّ مِنْ هٰذَا وَأَجْوَدُ إِسْنَادًا، وَقَدْ ذَهَبَ بَعْضُ أَهْلِ الْكُوفَةِ إِلیٰ هٰذَا الْحَدِیثِ، مِنْهُمْ وَكِیعُ بْنُ الْجَرَّاحِ .

''سیدہ ربیّع بنت عفراء رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے سر کا دو مرتبہ مسح کیا۔ اپنے سر کے پچھلے حصے سے شروع کیا پھر اگلے حصے کا مسح کیا اور اپنے دونوں کانوں کی اندرونی و بیرونی جانب مسح کیا۔ یہ حدیث حسن ہے، جبکہ سیدنا عبد اللہ بن زید رضی اللہ عنہ کی بیان کردہ حدیث صحیح تر اور سند کے اعتبار سے زیادہ عمدہ ہے۔ بعض اہل کوفہ اس حدیث کے مطابق عمل کرتے ہیں۔ ان میں سے امام وکیع بن جراح رحمہ اللہ بھی ہیں۔''(جامع الترمذي: ٣٣،٣٢، طبع دارالسلام، بالرياض)

جامع ترمذی میں یہ سب سے پہلا مقام ہے جہاں امام ترمذی رحمہ اللہ نے کسی حدیث کے لیے حَدِيثٌ حَسَنٌ کا اطلاق کیا ہے۔ اور یہاں کتنے صاف الفاظ میں امام ترمذی رحمہ اللہ نے اپنی ''حسن'' کو خود مرجوح اور نا قابل عمل قرار دیا ہے۔ اگر امام ترمذی رحمہ اللہ کی ''حسن'' سے مراد قابل حجت و قابل عمل حدیث ہوتی تو وہ کبھی ایک حدیث کو ''حسن'' کہنے کے ساتھ ساتھ اس پر ایسا تبصرہ نہ فرماتے۔

پھر یہ بات بھی غور طلب ہے کہ اس حدیث کا دارومدار عبد اللہ بن محمد بن عقیل پر ہے جیسا کہ علامہ عبد الرحمٰن محدث مبارکپوری رحمہ اللہ، علامہ شوکانی سے نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

حَدِيثُ رُبَيِّعِ بِنْتِ مُعَوِّذٍ هٰذَا لَهٗ رِوَايَاتٌ وَّأَلْفَاظٌ، مَدَارُ الْكُلِّ عَلىٰ عَبْدِ اللّٰهِ ابْنِ مُحَمَّدِ بْنِ عَقِيلٍ، وَفِيهِ مَقَالٌ مَشْهُورٌ لَّاسِيَّمَا إِذَا عَنْعَنَ، وَقَدْ فَعَلَ ذٰلِكَ فِي جَمِيعِهَا . ''سیدہ ربیّع بنت معوّذ رضی اللہ عنہا کی اس حدیث کی کئی سندیں اور کئی الفاظ ہیں۔ سب کا دارومدار عبد اللہ بن محمد بن عقیل پر ہے اور ان کے بارے میں (محدثین کی) کلام (جرح) مشہور ہے خصوصاً جب وہ عَنْ کے لفظ سے بیان کریں۔ تمام سندوں میں انہوں نے ایسا ہی کیا ہے۔'' آخر میں مبارکپوری رحمہ اللہ لکھتے ہیں: وَهُوَ مَذْهَبٌ مَّرْجُوحٌ، وَالْمَذْهَبُ الرَّاجِحُ الْمُعَوَّلُ عَلَيْهِ هُوَ الْبَدَاءَةُ بِمُقَدَّمِ الرَّأْسِ .

''یہ مرجوح مذہب ہے۔ راجح مذہب جس پر اعتماد کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ سر کا مسح سر کے اگلے حصے سے شروع کیا جائے۔(تحفة الاحوذي: ١/١١٢، ١١٣، طبع دار الكتب العلمية بيروت)

یعنی اس حدیث کی پورے ذخیرۂ حدیث میں کوئی ایسی سند نہیں جس میں عبد اللہ بن محمد بن عقیل موجود نہ ہو، جبکہ زیادہ ''ضعیف'' سندوں کے آپس میں مل کر ''حسن'' ہونے کے جو علمائے

کرام قائل ہیں، ان کے نزدیک یہ حدیث اس وقت تک ''حسن'' نہیں بن سکتی جب تک عبد اللہ بن محمد بن عقیل کی متابعت موجود نہ ہو۔ پھر اس حدیث کے شواہد (مؤید احادیث) بھی موجود نہیں جیسا کہ خود امام ترمذی رحمہ اللہ کے عمل سے یہ بات ثابت ہوتی ہے۔ اگر اس کا کوئی شاہد (مؤید حدیث) امام صاحب کی نظر میں ہوتا تو وہ اسے اپنے اسلوب کے مطابق وَفِي الْبَابِ کہہ کر ذکر کر دیتے۔ اگر کسی صاحبِ علم کے پاس اس حدیث کی کوئی اور سند یا کوئی شاہد موجود ہو تو وہ اسے افادۂ عام کے لیے پیش کرے۔

یہ تھی پہلی حدیث جسے امام ترمذی رحمہ اللہ نے ''حسن'' قرار دیا ہے اور اسی حدیث سے یہ معلوم ہو رہا ہے کہ امام ترمذی رحمہ اللہ کی اصطلاحِ ''حسن'' کا مطلب امام ترمذی رحمہ اللہ کے نزدیک قطعاً یہ نہیں کہ اس کی ایک سے زائد خفیف ''ضعف'' والی سندیں ہیں اور وہ مل کر قابل حجت بنتی ہیں۔ ایک مقام پر امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ عبد اللہ بن محمد بن عقیل صدوق (معتبر) راوی ہیں۔ اگرچہ بعض محدثین کرام نے ان کے حافظے پر جرح کی ہے۔

(جامع الترمذي، تحت الحديث: ٣، طبع دار السلام، بالرياض)

اگر بالفرض امام صاحب اس کا یہ خفیف ''ضعف'' دُور کرنا چاہتے ہوتے تو اس کی کوئی اور سند یا کوئی شاہد پیش کرتے اور اگر ایسا ہوتا تو پھر اس کے خلاف پہلی حدیث کو راجح قرار نہ دیتے۔

② امام ترمذی رحمہ اللہ رفع الیدین کی احادیث بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

بَابُ مَا جَاءَ فِي رَفْعِ الْيَدَيْنِ عِنْدَ الرُّكُوعِ.

''ان احادیث کا بیان جن میں رکوع کرتے وقت رفع الیدین کا ذکر ہے۔''

...... عَنْ سَالِمٍ عَنْ أَبِيهِ، قَالَ: رَأَيْتُ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، إِذَا افْتَتَحَ الصَّلَاةَ يَرْفَعُ يَدَيْهِ حَتّٰى يُحَاذِيَ مَنْكِبَيْهِ، وَإِذَا رَكَعَ وَإِذَا رَفَعَ رَأْسَهُ مِنَ الرُّكُوعِ، وَزَادَ ابْنُ أَبِي عُمَرَ فِي حَدِيثِهِ: وَكَانَ لَا يَرْفَعُ بَيْنَ السَّجْدَتَيْنِ ...... وَفِي الْبَابِ عَنْ عُمَرَ وَعَلِيٍّ وَوَائِلِ بْنِ حُجْرٍ وَمَالِكِ بْنِ الْحُوَيْرِثِ وَأَنَسٍ وَأَبِي هُرَيْرَةَ وَأَبِي حُمَيْدٍ وَأَبِي أُسَيْدٍ وَسَهْلِ بْنِ سَعْدٍ وَمُحَمَّدِ بْنِ مَسْلَمَةَ وَأَبِي قَتَادَةَ وَأَبِي مُوسَى الْأَشْعَرِيِّ وَجَابِرٍ وَعُمَيْرٍ اللَّيْثِيِّ، قَالَ أَبُو عِيسٰى: حَدِيثُ ابْنِ عُمَرَ

حَدِيثٌ حَسَنٌ صَحِيحٌ، وَبِهٰذَا يَقُولُ بَعْضُ أَهْلِ الْعِلْمِ مِنْ أَصْحَابِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، مِنْهُمُ ابْنُ عُمَرَ وَجَابِرُ بْنُ عَبْدِ اللّٰهِ وَأَبُو هُرَيْرَةَ وَأَنَسٌ وَابْنُ عَبَّاسٍ وَعَبْدُ اللّٰهِ بْنُ الزُّبَيْرِ وَغَيْرُهُمْ، وَمِنَ التَّابِعِينَ الْحَسَنُ الْبَصْرِيُّ وَعَطَاءٌ وَطَاوُسٌ وَمُجَاهِدٌ وَنَافِعٌ وَسَالِمُ بْنُ عَبْدِ اللّٰهِ وَسَعِيدُ بْنُ جُبَيْرٍ وَغَيْرُهُمْ، وَبِهٖ يَقُولُ مَالِكٌ وَمَعْمَرٌ وَالْأَوْزَاعِيُّ وَابْنُ عُيَيْنَةَ وَعَبْدُ اللّٰهِ بْنُ الْمُبَارَكِ وَالشَّافِعِيُّ وَأَحْمَدُ وَإِسْحَاقُ، وَقَالَ عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ الْمُبَارَكِ: قَدْ ثَبَتَ حَدِيثُ مَنْ يَرْفَعُ يَدَيْهِ، وَذَكَرَ حَدِيثَ الزُّهْرِيِّ عَنْ سَالِمٍ عَنْ أَبِيهِ، وَلَمْ يَثْبُتْ حَدِيثُ ابْنِ مَسْعُودٍ: أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَمْ يَرْفَعْ يَدَيْهِ إِلَّا فِي أَوَّلِ مَرَّةٍ ...... كَانَ مَالِكُ بْنُ أَنَسٍ يَرىٰ رَفْعَ الْيَدَيْنِ فِي الصَّلَاةِ، وَقَالَ يَحْيَى: وَحَدَّثَنَا عَبْدُ الرَّزَّاقِ قَالَ: كَانَ مَعْمَرٌ يَرىٰ رَفْعَ الْيَدَيْنِ فِي الصَّلَاةِ، وَسَمِعْتُ الْجَارُودَ بْنَ مُعَاذٍ يَقُولُ: كَانَ سُفْيَانُ بْنُ عُيَيْنَةَ وَعُمَرُ بْنُ هَارُونَ وَالنَّضْرُ بْنُ شُمَيْلٍ يَرْفَعُونَ أَيْدِيَهُمْ إِذَا افْتَتَحُوا الصَّلَاةَ وَإِذَا رَكَعُوا وَإِذَا رَفَعُوا رُءُوسَهُمْ.

''سالم اپنے والد (سیدنا ابنِ عمر رضی اللہ عنہما) سے بیان کرتے ہیں: میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا۔آپ جب نماز شروع کرتے، رکوع کو جاتے اور رکوع سے سر اُٹھاتے تو اپنے کندھوں کے برابر رفع الیدین فرماتے تھے۔ ایک روایت میں یہ الفاظ زائد ہیں کہ آپ دونوں سجدوں کے درمیان رفع الیدین نہیں کرتے تھے............ اس مسئلے میں سیدنا عمر، سیدنا علی، سیدنا وائل بن حجر، سیدنا مالک بن حویرث، سیدنا انس، سیدنا ابو ہریرہ، سیدنا ابوحمید، سیدنا ابو اُسید، سیدنا سہل بن سعد، سیدنا محمد بن مسلمہ، سیدنا ابوقتادہ، سیدنا ابوموسیٰ اشعری، سیدنا جابر، سیدنا عمیر لیثی رضی اللہ عنہم سے احادیث مروی ہیں۔ سیدنا عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث حسن صحیح ہے۔ بعض (بقولِ امام بخاری رحمہ اللہ تمام۔ ناقل ☆)اہل علم صحابہ کرام کا یہی مذہب ہے۔ان صحابہ کرام میں سیدنا عبداللہ بن

☆ اس سلسلے میں امام بخاری رحمہ اللہ کی بات ہی راجح ہے۔بعض صحابہ کرام سے عدمِ رفع کی جو روایات مروی ہیں، ان میں سے ایک بھی اُصولِ محدثین کے مطابق ثابت نہیں۔تفصیل کے لیے دیکھیں: ماہنامہ ضربِ حق، شمارہ نمبر ⑩.

عمر، سیدنا جابر بن عبد اللہ، سیدنا ابو ہریرہ، سیدنا انس، سیدنا عبد اللہ بن عباس، سیدنا عبد اللہ بن زبیر وغیرہم رضی اللہ عنہم شامل ہیں۔ تابعین عظام میں سے امام حسن بصری، امام عطاء بن ابی رباح، امام طاؤس، امام مجاہد، امام نافع، امام سالم بن عبد اللہ، امام سعید بن جبیر وغیرہم رضی اللہ عنہم کا یہی مذہب ہے۔ امام مالک، امام معمر، امام اوزاعی، امام سفیان بن عیینہ، امام عبد اللہ بن مبارک، امام شافعی، امام احمد بن حنبل، امام اسحاق بن راہویہ وغیرہم رحمہم اللہ کا یہی قول ہے۔ امام عبد اللہ بن مبارک رحمہ اللہ فرماتے ہیں: رفع الیدین کرنے والے لوگوں کی دلیل، یعنی سیدنا عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث ثابت ہے جبکہ سیدنا عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی وہ حدیث ثابت نہیں جس میں یہ ذکر ہے کہ نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف پہلی دفعہ رفع الیدین کیا ہے .... امام مالک بن انس رحمہ اللہ بھی نماز میں رفع الیدین کے قائل تھے۔ یحییٰ کا بیان ہے کہ ہمیں امام عبد الرزاق رحمہ اللہ نے بیان کیا: امام معمر رحمہ اللہ نماز میں رفع الیدین کرتے تھے۔ میں نے جارود بن معاذ کو یہ بیان کرتے سنا کہ امام سفیان بن عیینہ، عمر بن ہارون اور امام نضر بن شمیل نماز شروع کرتے، رکوع جاتے اور رکوع سے سر اُٹھاتے وقت رفع الیدین کیا کرتے تھے۔''

اس کے بعد امام صاحب فرماتے ہیں: بَابُ مَا جَاءَ أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَمْ يَرْفَعْ إِلَّا فِي أَوَّلِ مَرَّةٍ. ''اس حدیث کا بیان جس میں یہ ذکر ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف پہلی دفعہ رفع الیدین کیا تھا۔''

...... عَنْ عَلْقَمَةَ قَالَ: قَالَ عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ مَسْعُودٍ: أَلَا أُصَلِّي بِكُمْ صَلَاةَ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ؟ فَصَلّٰى فَلَمْ يَرْفَعْ يَدَيْهِ إِلَّا فِي أَوَّلِ مَرَّةٍ، قَالَ: وَفِي الْبَابِ عَنِ الْبَرَاءِ بْنِ عَازِبٍ، قَالَ أَبُو عِيسٰى: حَدِيثُ ابْنِ مَسْعُودٍ حَدِيثٌ حَسَنٌ، وَبِهٖ يَقُولُ غَيْرُ وَاحِدٍ مِنْ أَهْلِ الْعِلْمِ مِنْ أَصْحَابِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَالتَّابِعِينَ، وَهُوَ قَوْلُ سُفْيَانَ الثَّوْرِيِّ وَأَهْلِ الْكُوفَةِ.

''علقمہ بیان کرتے ہیں کہ سیدنا عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: کیا میں تمہیں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز پڑھ کر نہ دکھاؤں؟ پھر انہوں نے صرف پہلی دفعہ رفع الیدین کیا، دوبارہ نہیں کیا۔ اس بارے میں سیدنا براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے بھی ایک حدیث مروی ہے۔ سیدنا عبد اللہ بن

مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث حسن ہے ۔ نبیؐ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے کئی صحابہ کرام اور تابعین اسی کے مطابق فتویٰ دیتے تھے (صحابہ کرام اور جمہور تابعین کے بارے میں یہ بات ثابت نہیں۔ ناقل)۔ امام سفیان ثوری اور اہل کوفہ کا یہی مذہب ہے۔''

(جامع الترمذي ، رقم الحديث : ٢٥٧، طبع دار السلام، بالرياض)

ملاحظہ فرمائیں کہ امام ترمذی رحمہ اللہ مؤخر الذکر حدیث پر امام عبد اللہ بن مبارک رحمہ اللہ کی جرح پہلی حدیث کے تحت ذکر کر آئے ہیں ۔ پھر اس حدیث کو ''حسن'' بھی قرار دے رہے ہیں ۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ امام ترمذی رحمہ اللہ کے نزدیک اس اصطلاحِ ''حسن'' سے مراد ایسی حدیث نہیں ہوتی جو قابل حجت ہو۔

نصب الرایہ کے حاشیے پر ایک تعلیق تھی جس کا مضمون یہ تھا کہ امام ترمذی رحمہ اللہ نے سیدنا ابنِ مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث کو حجت سمجھتے ہوئے ''حسن'' کہا ہے ۔ اس کا ردّ کرتے ہوئے ایک عرب محقق دکتور حمزہ ملیباری لکھتے ہیں :

''تعلیق لکھنے والے شخص نے کہا ہے کہ سیدنا ابنِ مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث امام ترمذی رحمہ اللہ کے نزدیک ثابت ہے ۔ شاید یہ بات اس نے امام ترمذی رحمہ اللہ کے اس حدیث کو حسن کہنے سے اخذ کی ہے ۔ لیکن یہ بات محل نظر ہے کیونکہ امام ترمذی رحمہ اللہ کا کسی حدیث کو حسن کہنے کا مقصد نبیؐ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس حدیث کا ثبوت کا اعتقاد نہیں، بلکہ صرف یہ بتانا ہوتا ہے کہ اس حدیث کے متن میں غرابت نہیں ، یعنی یہ متن شاذ نہیں نیز شواہد کی وجہ سے معروف ہونے کی بنا پر غریب بھی نہیں ۔ وہ شواہد نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت یا عمل کی صورت میں بھی ہو سکتے ہیں اور بعض صحابہ و تابعین کے قول کی صورت میں بھی ہو سکتے ہیں اگرچہ اس بارے میں نبیؐ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ بھی ثابت نہ ہو۔

یہی وجہ ہے کہ ہم بہت سارے مقامات پر دیکھتے ہیں کہ امام صاحب حدیث کو مرفوع روایت کے اعتبار سے معلول قرار دیتے ہیں اور اس میں راوی کی غلطی واضح کرتے ہیں پھر ساتھ ہی اس کے متن کو حسن بھی کہہ دیتے ہیں جیسا کہ ہم نے اس حدیثِ (سیدنا عبد اللہ بن مسعود) میں دیکھ لیا ہے کہ امام صاحب نے امام عبد اللہ بن مبارک رحمہ اللہ کی طرف سے اس حدیث میں علت بیان کی ہے ۔ اس پر کوئی تعاقب بھی نہیں کیا ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حدیث ان کے

ہاں مرفوع ثابت نہیں ۔ پھر اس کے بعد انہوں نے اس اسے حسن بھی قرار دیا ہے اور اپنے حسن کہنے کے سبب کی طرف یہ کہہ کر توجہ دلائی ہے کہ کئی اہل علم صحابہ کرام اور تابعین اس کے قائل ہیں اور یہی امام سفیان ثوری اور اہل کوفہ کا مذہب ہے ۔ لہٰذا امام ترمذی رحمہ اللہ کے کسی حدیث کو حسن قرار دینے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ امام صاحب کے ہاں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے اور قابل حجت ہے ....۔''

(الموازنة بين المتقدمين والمتأخرين في تصحيح الأحاديث وتعليلها : ص ٨١ ، ملتقى أهل الحديث)

یہ بھی ملحوظ رہے کہ محدثین کرام کا اتفاق ہے کہ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی اس حدیث میں علت سفیان ثوری رحمہ اللہ کی جانب سے واقع ہوئی ہے ۔ پھر اس حدیث کا مدار بھی سفیان ثوری رحمہ اللہ پر ہے ۔ پورے ذخیرۂ حدیث میں اس حوالے سے امام سفیان ثوری رحمہ اللہ کی متابعت کسی نے نہیں کی ۔ اگر امام ترمذی رحمہ اللہ کی ''حسن'' سے مراد کئی کم ضعف والی سندیں ہوتیں جو ان کے نزدیک سب کے ملنے سے '' قابل حجت حسن'' بن جاتی ہوتیں تو یہ حدیث ان کے نزدیک کبھی ''حسن'' نہ ہوتی کیونکہ سفیان ثوری رحمہ اللہ کے واسطے کے بغیر ذخیرۂ حدیث میں اس حدیث کی کوئی سند نہیں ۔

دکتور حمزہ صاحب کی یہ بات بالکل بجا ہے کہ امام ترمذی رحمہ اللہ اپنی اصطلاحِ ''حسن'' سے قابل حجت اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت حدیث مراد نہیں لیتے بلکہ بسا اوقات امام صاحب کی مراد صرف یہ ہوتی ہے کہ اس پر صحابہ و تابعین کا عمل ہے ۔ اس کی ایک مثال ہم ساتھ ہی بیان کیے دیتے ہیں ۔

③ امام ترمذی رحمہ اللہ ایک حدیث بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

كَانَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا جَلَسَ فِي الرَّكْعَتَيْنِ الْأُولَيَيْنِ كَأَنَّهُ عَلَى الرَّضْفِ .... قَالَ أَبُو عِيسىٰ : هٰذَا حَدِيثٌ حَسَنٌ إِلَّا أَنَّ أَبَا عُبَيْدَةَ لَمْ يَسْمَعْ مِنْ أَبِيهِ، وَالْعَمَلُ عَلىٰ هٰذَا عِنْدَ أَهْلِ الْعِلْمِ يَخْتَارُونَ أَنْ لَّا يُطِيلَ الرَّجُلُ الْقُعُودَ فِي الرَّكْعَتَيْنِ الْأُولَيَيْنِ، وَلَا يَزِيدَ عَلَى التَّشَهُّدِ شَيْئًا، وَقَالُوا : إِنْ زَادَ عَلَى التَّشَهُّدِ فَعَلَيْهِ سَجْدَتَا السَّهْوِ، هٰكَذَا رُوِيَ عَنِ الشَّعْبِيِّ وَغَيْرِهِ .

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب پہلی دو رکعتوں کے بعد تشہد بیٹھتے تو یوں (جلدی سے تیسری رکعت کے لیے اُٹھ جاتے) جیسے گرم پتھر پر ہوں ۔ یہ حدیث حسن ہے ، مگر ابو عبیدہ نے اپنے والد (سیدنا

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ) سے سماع نہیں کیا۔ اہل علم کا اس حدیث پر عمل ہے۔ وہ یہ پسند کرتے ہیں کہ آدمی دو رکعتوں کے بعد تشہد کو لمبا نہ کرے اور تشہد سے زائد کچھ نہ پڑھے۔ ان کا کہنا ہے کہ اگر وہ تشہد سے کوئی چیز (درود، دُعائیں) زائد پڑھے گا تو اس پر سہو کے دوسجدے لازم ہو جائیں گے۔ امام شعبی رحمہ اللہ وغیرہ سے اسی طرح مروی ہے۔''

(جامع الترمذي، رقم الحدیث: ٣٦٦، طبع دار السلام، بالریاض)

امام ترمذی رحمہ اللہ نے اس حدیث میں خود وجہِ ضعف بیان کرنے کے باوجود اسے ''حسن'' قرار دیا ہے۔ یہ بھی ملحوظ رہے کہ پورے ذخیرۂ حدیث سے اس حدیث کی کوئی ایسی سند دریافت نہیں ہوسکی جس میں ابوعبیدہ کا واسطہ نہ ہو، یعنی ابوعبیدہ اس حدیث کے مرکزی راوی ہیں اور ان کا اپنے والد سے سماع نہیں۔ پھر بھی امام ترمذی رحمہ اللہ نے اسے ''حسن'' قرار دیا ہے۔ اور اس کی وجہ صاف ظاہر ہے کہ انہوں نے بعد میں بعض اہل علم کا عمل اس پر پیش کیا ہے۔ یعنی امام ترمذی رحمہ اللہ کی اصطلاحِ ''حسن'' عام محدثین کرام کی قابل حجت ''حسن'' سے ہٹ کر ایک اصطلاح ہے جس کے ضمن میں یہ بات بھی شامل ہے کہ اہل علم کے عمل کی وجہ سے بھی حدیث ''حسن'' ہو جاتی ہے چاہے اس بارے میں نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ بھی ثابت نہ ہو سکے۔ اس سے بڑھ کر اس بات پر اور کیا دلیل ہوسکتی ہے کہ امام ترمذی رحمہ اللہ کی اپنی اصطلاحِ ''حسن'' سے مراد ایسی حدیث نہیں ہوتی جو کم ضعف والی زیادہ سندوں کے ملنے سے قابل حجت حسن بن جائے ؟؟؟

پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ امام ترمذی رحمہ اللہ کی جانب سے ''حسن'' کی تعریف میں جو ایک سے زائد سندوں سے مروی ہونے کے الفاظ ہیں، ان کا کیا مطلب ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ کسی حدیث کو کسی بھی طبقے میں ایک سے زائد راوی بیان کریں تو اس کی سندیں ایک سے زائد ہو جاتی ہیں۔ مثلاً ہم انہی حدیثوں کو دیکھتے ہیں جو ''ضعیف+ضعیف=حسن'' کے اصول کو ماننے والوں کے ہاں بھی قابل حجت نہیں بنتیں۔ ان حدیثوں کی سندیں بھی ایک سے زائد ہیں، جیسا کہ:

① پہلی حدیث جو سر کے پچھلے حصے سے مسح شروع کرنے کے متعلق تھی اس کی سند کا نقشہ یوں ہے:
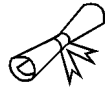
صحابیہ سیدہ ربیّع بنت معوذ

(مرکزی راوی) عبداللہ بن محمد بن عقیل

(مصنف ابن أبي شيبة : ۳۲/۱، الرقم : ۱۵۳، طبع مکتبة الرشد، بالرياض، جامع الترمذي، رقم الحديث : ۳۳، طبع دار السلام، بالرياض، سنن أبي داوٗد، رقم الحديث : ۱۲۶، طبع دار السلام، بالرياض ، المعجم الكبير للطبراني : ۲۶۸/۲٤، طبع دار إحياء التراث العربي)

یہاں سے سندیں مختلف ہوتی ہیں

عبداللہ بن محمد بن عقیل سے بیان کرنے والے یہ دو شاگرد ہیں:

سفیان بن سعید الثوری	بشر بن مفضّل
مصنف ابن أبي شيبة : ۳۲/۱، الرقم : ۱۵۳، طبع مکتبة الرشد، بالرياض، المعجم الكبير للطبراني : ۲۶۸/۲٤، طبع دار إحياء التراث العربي	سنن أبي داوٗد، رقم الحديث : ۱۲۶، طبع دار السلام، بالرياض، جامع الترمذي، رقم الحديث : ۳۳، طبع دار السلام، بالرياض

اس کے بعد سفیان ثوری سے اور بشر بن مفضّل کے شاگردوں کے ایک سے زائد ہونے کی وجہ سے سندیں مزید زیادہ ہو جاتی ہیں ۔ یہی مطلب ہے امام ترمذی رحمہ اللہ کے ''حسن'' کی اصطلاح میں ایک سے زائد سندوں کی شرط لگانے کا ۔ واللہ اعلم!

② سیدنا عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ والی عدمِ رفع الیدین والی ''ضعیف'' حدیث کی سندیں بھی سفیان ثوری کے بہت سے شاگردوں کی وجہ سے بہت زیادہ ہو جاتی ہیں ۔ امام ترمذی رحمہ اللہ کی اصطلاحِ ''حسن'' میں ایک سے زائد سندوں کی شرط لگانے کا مطلب یہی ہے ۔ یہ نہیں کہ اس کی ایک سے زائد تھوڑے ضعف والی سندیں ہیں جو مل ملا کر قابل حجت ''حسن'' بن جاتی ہیں ۔ ایسا کہنا امام ترمذی رحمہ اللہ کے اسلوب کے خلاف ہے ۔

یہی بات سمجھ نہ پانے کی وجہ سے بعض علمائے کرام نے امام ترمذی رحمہ اللہ پر اس حوالے سے تنقید کی ہے ۔ وہ کہتے ہیں کہ امام ترمذی رحمہ اللہ نے ''حسن'' میں زائد سندوں کی شرط لگانے کے باوجود بہت سی غریب (ایک سند والی) حدیثوں کو ''حسن'' کہہ دیا ہے ۔ مثلاً حافظ ابنِ کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: فَإِنَّهُ يَقُولُ فِي كَثِيرٍ مِّنَ الْأَحَادِيثِ : هٰذَا حَدِيثٌ حَسَنٌ غَرِيبٌ، لَا نَعْرِفُهُ إِلَّا مِنْ هٰذَا الْوَجْهِ . ''امام ترمذی رحمہ اللہ بہت سی حدیثوں کے بارے میں یہ بھی کہہ دیتے ہیں کہ یہ حدیث حسن غریب ہے ۔ ہم اسے صرف اسی سند سے جانتے ہیں ۔''

(اختصار علوم الحديث لابن كثير : ص ۱۳۱، طبع دار المعارف، بالرياض)

حافظ عراقی رحمہ اللہ اُصولِ حدیث کو اشعار کی صورت میں لکھتے ہوئے فرماتے ہیں :

وَقَالَ التِّرمِذِيُّ : مَا سَلِمْ مِنَ الشُّذُوْذِ مَعَ رَاوٍ مَّا اتُّهِمْ
بِكَذِبٍ وَّلَمْ يَكُنْ فَرْداً وَرَدْ قُلْتُ : وَقَدْ حَسَّنَ بَعْضَ مَا انفَرَدْ

''امام ترمذی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ حسن حدیث وہ ہے جو شذوذ سے سلامت ہو اور اس کا کوئی راوی متہم بالکذب نہ ہو نہ وہ غریب (اکیلی) سند سے آئی ہو ۔ میں (عراقی) کہتا ہوں کہ امام صاحب نے (اس تعریف کے خلاف) بعض غریب حدیثوں کو بھی حسن کہہ دیا ہے ۔''

(ألفية العراقي، الرقم : ۵۱، ۵۲)

اس سے معلوم ہوا کہ اگر امام ترمذی رحمہ اللہ کی اصطلاحِ ''حسن'' کو اس معنیٰ پر محمول کیا جائے کہ اس سے مراد ''ضعیف+ضعیف=حسن'' ہے تو اس سے امام ترمذی رحمہ اللہ کے قول وفعل میں تناقض لازم آتا ہے اور اس طرف بعض علمائے کرام نے اشارہ بھی کیا ہے، حالانکہ امام ترمذی رحمہ اللہ کی یہ مراد نہیں ۔ واللہ اعلم !

رہا حافظ ابنِ صلاح رحمہ اللہ کا ''حسن'' کی اقسام بیان کرتے ہوئے یہ کہنا کہ تھوڑے ضعف کی حامل کئی سندوں والی حدیث سب سندوں کو ملا کر ''حسن'' بن جاتی ہیں وَكَلَامُ التِّرْمِذِيِّ عَلٰى هٰذَا الْقِسْمِ يُتَنَزَّلُ . ''اور امام ترمذی رحمہ اللہ کی کلام کو اسی پر محمول کیا جائے گا'' تو یہ ان کی خطا ہے ۔ اس کا ردّ کرتے ہوئے حافظ ابنِ کثیر رحمہ اللہ لکھتے ہیں :

قُلْتُ : لَا يُمْكِنُ تَنْزِيلُهُ لِمَا ذَكَرْنَاهُ عَنْهُ، وَاللّٰهُ أَعْلَمُ .

’’میں کہتا ہوں کہ امام ترمذی رحمہ اللہ کی کلام کو اس معنیٰ پر محمول کرنا اس وجہ سے ممکن نہیں جو ہم بیان کر چکے ہیں (کہ امام ترمذی رحمہ اللہ نے بعض ایک سند والی حدیثوں کو بھی حسن قرار دیا ہے) واللہ اعلم۔‘‘(اختصار علوم الحدیث لابن کثیر : ص ۱۳۳، طبع دار المعارف، بالریاض)

اس ساری بحث کے بعد ہمیں یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ امام ترمذی رحمہ اللہ کی اصطلاحِ ’’حسن‘‘ سے ’’ضعیف+ضعیف=حسن‘‘ کا اُصول کشید کرنا کسی طور درُست نہیں۔ ہمارا یہ دعویٰ ابھی تک اپنی جگہ پر قائم ہے کہ متقدمین محدثین جو اصطلاحِ حدیث میں ہمارے لیے حجت ہیں، ان میں سے کسی سے یہ اُصول ثابت نہیں۔

یہ بات بھی ذہن نشین رہنی چاہیے کہ یہ کوئی لفظی جھگڑا نہیں، یعنی ہمارا مطالبہ یہ نہیں کہ ہمیں متقدمین محدثین سے یہی لفظ دکھائے جائیں کہ ’’ضعیف+ضعیف=حسن‘‘، بلکہ ہم کہتے ہیں کہ اس اُصول کو ثابت کرنے کے لیے متقدمین محدثین سے کوئی ایسی عبارت پیش کر دی جائے جس کا یہ مفہوم ہو کہ اگر کسی حدیث کی ذخیرۂ حدیث میں موجود سب سندیں تھوڑی تھوڑی ’’ضعیف‘‘ بھی ہوں تو کثرتِ طرق سے ضعف ختم ہو جاتا ہے۔ اگر ایسا ہو جائے تو ان شاء اللہ ہمیں تسلیم کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ نہ ہو گی۔

بعض اصحاب کے ذہن میں یہ اشکال بہت زیادہ پیدا ہوتا ہے کہ اس اُصول کے ثبوت کے سلسلے میں متقدمین محدثین کی قید کیوں اور اُصولِ حدیث کے ثبوت کے لیے صرف متقدمین محدثین ہی حجت کیوں ہیں؟ تو اس کا جواب ہم ایک عرب محقق دکتور حاتم بن عارف العونی کی ایک فکر انگیز تحریر سے عرض کرتے ہیں، وہ ایک سوال کے جواب میں فرماتے ہیں:

’’پہلی بات یہ ہے کہ جس شخص کو علم حدیث سے کچھ مَس ہے اسے اس بات میں کوئی تردّد نہیں ہے کہ تیسری اور چوتھی صدی ہجری کے نقادِ حدیث ائمہ دین مثلاً امام یحییٰ بن معین، امام علی بن مدینی، امام احمد بن حنبل، امام بخاری، امام مسلم، امام ابو داؤد، امام ترمذی، امام نسائی، امام ابو حاتم، امام ابو زرعہ، امام ابنِ خزیمہ، امام عقیلی، امام عبدالرحمٰن بن ابی حاتم، امام ابنِ عدی، امام ابنِ حبان، امام دارقطنی رحمہم اللہ اور اس دَور کے دیگر علمائے حدیث، متاخرین مثلاً حافظ ذہبی، حافظ ابنِ حجر، حافظ سخاوی، علامہ سیوطی اور بعد والوں کے مقابلے میں بہت بہت گنا بڑھ کر عالم تھے۔

دوسری بات یہ ہے کہ جس شخص کو علم حدیث ، علمائے حدیث اور حالاتِ محدثین سے کچھ تعلق ہے اسے اس بات میں کوئی شک نہیں مذکورہ (متقدمین) محدثین کے قلوب و اذہان سب لوگوں سے بڑھ کر ان علوم سے پاک تھے جنہوں نے اسلامی علوم میں داخل ہو کر بہت بُرا اثر چھوڑا۔ علوم اسلامیہ پر بُرا اثر چھوڑنے والے ان علوم میں سے بطور مثال علم منطق اور اس کا پروردہ علم کلام ہے۔ متقدمین محدثین متاخرین کی طرح ان علوم سے بلاواسطہ یا بالواسطہ متاثر نہیں ہوئے جیسا کہ میں نے اس بات کی وضاحت اپنی کتاب المنهج المقترح میں کر دی ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ پہلی صدیوں میں علم حدیث محدثین کے ہاں زندہ تھا کیونکہ وہی لوگ تھے جو اس کی نشو ونما کے مراحل میں اس کے ہم رکاب ہوئے تھے اور انہی (متقدمین محدثین) نے علم حدیث کو لاحق ہونے والے خطرات کا سامنا کر کے اس کا دفاع کیا تھا، نیز یہ وہی لوگ تھے جنہوں نے علم حدیث کے لیے قواعد بنائے اور مکمل کیے تھے حتیٰ کہ علم حدیث اپنی تکمیل کو پہنچ گیا تھا۔ پھر اس زمانے کے بعد علم حدیث میں کمی شروع ہو گئی یہاں تک کہ وہ درجۂ اجنبیت کو پہنچ گیا (جیسا کہ حافظ ابن صلاح رحمہ اللہ نے بیان کیا ہے۔ ناقل)۔

یہی وجہ ہے کہ متاخرین پر علم حدیث کے بہت سے واضح مسائل پوشیدہ رہ گئے اور ان سے اس علم کی بعض اصطلاحات مخفی ہو گئیں۔ وہ بہت سے مقامات پر زبانِ حال یا مقال سے یہ اعلان کرنے لگے کہ ان کو متقدمین کے اقوال و مناہج کو تفصیلاً پڑھنے اور ان میں غور کرنے کی ضرورت ہے تاکہ علم حدیث کے اُن بڑے بڑے گھمبیر مسائل اور اصطلاحات کی وضاحت ہو جائے جو متقدمین کے ہاں بہت شفاف اور واضح تھیں۔

یہی وجہ ہے کہ میں نے متقدمین محدثین کو اپنی کتاب المنهج المقترح میں اہل اصطلاح کا نام دیا ہے اور متاخرین کے بارے میں بتایا ہے کہ وہ اہل اصطلاح نہیں ہیں کیونکہ متاخرین علماء متقدمین محدثین کی اصطلاحات کی ترجمانی کرنے والے اور ان کے نشاناتِ علم سے اُصولی و فروعی مسائل استنباط کرنے والے ہیں۔ متاخرین کا اس کے علاوہ کوئی کام نہیں کہ وہ ہمارے لیے کتابوں کی صورت میں متقدمین کے چھوڑے ہوئے کام کی حفاظت کریں۔

اس بحث سے ہمارے سامنے دونوں فریقوں (متقدمین اور متاخرین) میں فرق ظاہر ہو گیا

ہے ۔ یہ بہت بڑا فرق ہے جیسے بعض عرب وہ تھے جن کی لغت حجت تھی ، وہ اہل لغت کہلاتے ہیں اور بعض وہ ہیں جو ان کے بعد آئے اور اس بارے میں کتب تصنیف کیں بلکہ بعض لوگ ان کے ایک عرصہ بعد آئے جبکہ علم منطق نے لغت کے علوم کو بھی اُسی طرح بگاڑ دیا تھا جیسے دیگر علوم کو بگاڑا تھا اور علم لغت بھی اُسی طرح کمزور ہو گیا تھا جیسے دیگر علوم کمزور ہو گئے تھے ۔ جب متقدمین اور متاخرین کی نسبت معاملہ ایسا ہے تو بھلا اب کوئی شخص اس بات میں شک کرے گا کہ متقدمین اور متاخرین میں بہت فرق ہے؟

میرا سوال ہے کہ اگر دو آدمی کسی علم کے بارے میں بات کریں ۔ ایک آدمی اس علم کا زیادہ عالم بلکہ اس علم کی بنیاد رکھنے والوں میں سے ہو اور دوسرا کئی گنا کم علم رکھنے والا ہو بلکہ اس کا زیادہ سے زیادہ کام پہلے آدمی کی کلام کو سمجھنا اور اس کے منہج کی وضاحت تلاش کرنا ہو تو دونوں میں سے کون اس علم کے مسائل کی معرفت کا زیادہ اہل ہو گا اور کس کا قول زیادہ دُرست اور زیادہ صحیح ہو گا؟ اس سوال کو مزید وضاحت سے کہیں تو یوں ہو گا کہ اگر متاخرین میں سے کوئی کسی حدیث کو (متقدمین کے برعکس) صحیح قرار دے تو کیا اس کے حکم کو دُرست قرار دینے پر یہ چیزیں اثر انداز نہیں ہوں گی کہ وہ متقدمین کے مقابلے میں کم علم ہے اور اس کی سوچ وفکر کئی ایسے علوم سے متاثر ہوئی ہے جو علم حدیث سے ہٹ کر ہیں ، نیز وہ ہمیشہ علم حدیث کے بعض اہم مسائل اور اصطلاحات کو سمجھنے اور ان کی وضاحت طلب کرنے کا ضرورت مند ہے؟

جب متاخرین میں سے کوئی عالم حدیث کو قبول یا ردّ کرنے کے بارے میں کوئی قاعدہ بنائے یا جرح وتعدیل کے اعتبار سے راویوں کے مراتب مقرر کرنے کے سلسلے میں کوئی اُصول وضع کرے ، پھر ہمیں معلوم ہو جائے کہ یہ قاعدہ یا اُصول متقدمین محدثین کے اقوال و اسالیب سے ثابت ہونے والے واضح قاعدے یا صریح منہج کے خلاف ہے تو کون اس بات میں تردّد کرے گا کہ اس بارے میں اُن متقدمین کی بات ہی معتبر ہے جو اہل اصطلاح اور واضعین علم ہیں؟!!! یقیناً میرے علم میں کوئی ایسا شخص نہیں جو اس بات میں اختلاف کرے کیونکہ میں ایسے طالب علم کا تصور بھی نہیں کرسکتا جسے علم کا ماخذ ہی معلوم نہ ہو ۔

رہی بات ان لوگوں کی جو یہ کہتے ہیں کہ متاخرین علمائے حدیث مثلاً حافظ ذہبی، حافظ

عراقی، حافظ ابنِ حجر، حافظ سخاوی اور حافظ سیوطی رحمہم اللہ قواعدِ حدیث میں متقدمین کے منہج کو زیادہ جانتے ہیں، نیز انہوں نے متقدمین کے مذہب کی تائید کی ہے (لہٰذا متاخرین بھی حجت ہیں)............ ان کو میرا جواب یہ ہے کہ جب متاخرین متقدمین سے اختلاف کریں (اور یہ اختلاف صحیح حدیث کی تعریف سے لے کر مدبّج تک بہت زیادہ ہوا ہے) تو پھر فیصلہ کیا ہوگا؟ کس کی طرف رجوع کیا جائے گا؟ کیا بھلا متقدمین کے اسالیب، احکام اور اقوال ہی قابل اعتبار نہیں ہوں گے؟ یا ایسی باتیں کرنے والا شخص ہم سے یہ مطالبہ کرتا ہے کہ ہم متقدمین ائمہ کے اقوال میں غور وفکر کا دروازہ بند کر دیں؟ کتنی مشابہت ہے اس شخص کی مقلدین سے! ہم دلیل کی پیروی کرنے والے لوگ اپنے مذاہب کی تقلید کرنے والوں کے سامنے دلائل پیش کرتے ہیں اور ان کی ایسی باتوں سے بڑا متعجب اور ناراض ہوتے ہیں کہ ہمارا امام ان دلائل کو تم سے زیادہ جانتا تھا، ہر وہ دلیل جو ہمارے امام کے قول کے خلاف ہوگی وہ منسوخ یا مؤوّل ہوگی............

لیکن میں بعض دلیل کے پیروکاروں کو دیکھتا ہوں کہ وہ اسی طرح کی باتیں کرنے لگے ہیں۔ جب یہ شخص ہم سے متقدمین کے مناہج و اقوال میں غور وفکر کے دروازے کو بند کرنے کا مطالبہ نہیں کرتا بلکہ وہ خود اسی منہج کی تائید کرتا ہے تو پھر وہ اس منہج کی طرف دعوت دینے والوں پر کیا اعتراض کرتا ہے؟ مجھے ڈر ہے کہ اصطلاحاتِ حدیث میں منہج سلف کی طرف دعوت دینے والوں پر طعن کرنے والے شخص کو یہ حرکت شعوری یا لاشعوری طور پر اندھی تقلید کی طرف لے جائے گی۔ یوں دلیل کی طرف رجوع جو کہ سلفیت کی بنیاد ہے، منہدم ہو جائے گی۔ علوم حدیث کی تحقیقات میں ہمارے منہج کی مخالفت کرنے والے معاصرین کی یہ صورتِ حال ہمارے مشاہدے میں ہے۔

ہم تو اہل بدعت کے لیے مضحکہ بن جائیں گے کہ فقہی فروع میں تو اجتہاد کرتے ہیں جبکہ علوم حدیث میں تقلید کر رہے ہیں اور علمائے کرام کی عقیدے کی غلطیوں کی نشاندہی کرنے پر تو راضی ہیں جبکہ مصطلحاتِ حدیث میں ان کی غلطی کی نشاندہی پر ناراض ہوتے ہیں............ متاخرین کی علوم حدیث میں غلطیاں ہمیشہ ایسی نہیں ہوتیں جو عام غلطیوں کی طرح جزوی ہوں اور ان کا آسانی سے ادراک کیا جا سکے اور ان غلطیوں سے اس علم پر کوئی سنگین اثر نہ پڑے بلکہ ان میں سے بعض غلطیاں

ایسی ہیں جن کا نتیجہ خطرناک منہجی غلطی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے............۔

آخر میں مَیں ہر اس شخص کو نصیحت کروں گا جو متقدمین کے منہج کو زندہ کرنے کے شرف و اجر سے محروم ہے کہ وہ جلدی سے اس منہج پر عمل پیرا ہونے والے لوگوں کا ہم رکاب ہو جائے۔ منہج متقدمین وہ منہج ہے جس کے پیروکار اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے روز بروز بڑھ رہے ہیں ۔ بھائی ! تجھے حسد اور تکبر جیسی نفسانی خواہشات حق کی طرف رجوع کرنے سے روکے نہ رکھیں ورنہ حق اور اہل حق کے غلبے کی وجہ سے تیری پریشانی، غم اور گناہ میں اضافہ ہوتا جائے گا کیونکہ اگر باطل کی حکومت بھی آجائے تو حق ہمیشہ غالب ہوتا ہے مغلوب نہیں ہوتا ۔ دلیل کا غلبہ ہر زمانے میں حق کو ہی حاصل ہوتا ہے ۔''

(الحديث الحسن بين الحدّ والحجية لمحمد أحمد جلمد : ص ٣٨۔٤٢)

یہی ہماری دعوت ہے کہ متاخرین جس طرح عقیدے کے بعض معاملات میں علم کلام سے متاثر ہو کر متقدمین کے منہج سے ہٹ گئے ہیں ، اسی طرح کئی معاملات میں فقہی موشگافیوں ،علم منطق اور علم کلام سے متاثر ہو کر وہ علم حدیث اور اُصولِ حدیث میں بھی غلطی کھا گئے ہیں ۔ لہٰذا ضروری ہے کہ جیسے ہم دیگر معاملات میں دلیل طلب کرنے کی روش اپناتے ہیں اسی طرح علوم حدیث میں بھی دلیل کے طالب ہوں اور صرف متاخرین کی کتبِ اصطلاح سے مرعوب ہو کر علم حدیث میں متقدمین کے منہج کو نہ چھوڑیں۔

آئندہ قسط میں ہم بیان کریں گے کہ متقدمین کسی ایسی حدیث کو قابل حجت نہیں سمجھتے تھے جس کی سب سندوں میں تھوڑا تھوڑا ضعف ہوتا تھا بلکہ اس حوالے ان کا طریقہ یہ تھا کہ فلاں حدیث کی سب سندیں ضعیف ہیں اور فلاں حدیث کے سب طرق میں تھوڑی تھوڑی کمزوی ہے وغیرہ۔ وہ ایسی حدیث کو قابل حجت نہیں سمجھتے تھے ۔ اس حوالے سے متقدمین محدثین کے کلام سے مثالیں بھی پیش کی جائیں گی اور متقدمین اور متاخرین کے منہج کا موازنہ بھی کیا جائے گا ۔

اللہ تعالیٰ سے دُعا ہے کہ وہ حق کو سمجھنے اور اس پر عمل پیرا ہونے کی توفیق عطا فرمائے ۔ آمین !